www.urducouncil.nic.in
قیمت : ₹ 15/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اگست 2026

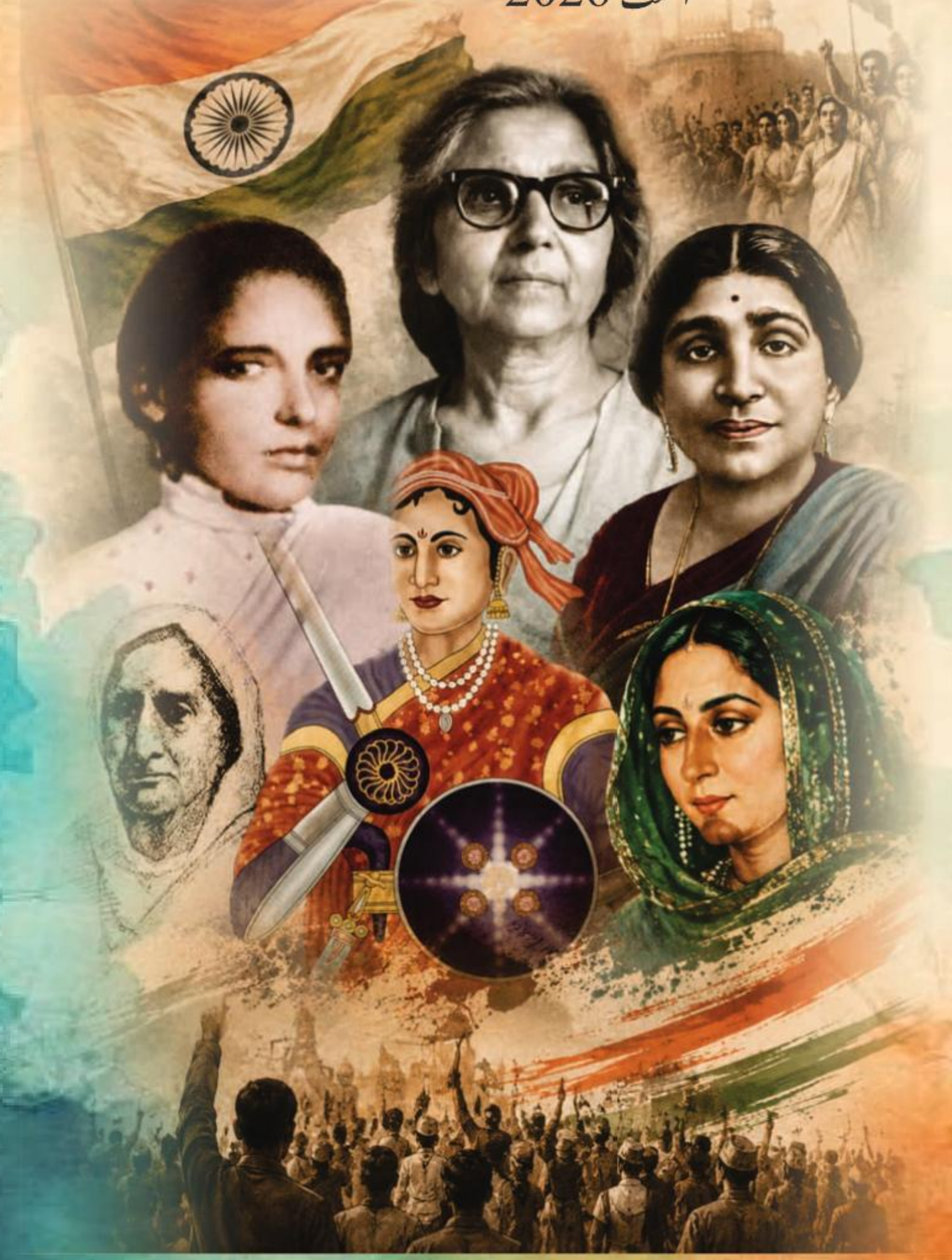

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ♦ زبان شناسی
- میرا بچپن ♦ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

ادار یہ

مشعل — مدیر — 4

روبرو

اردو کی تہذیب اور شناخت کو برقرار رکھنا ضروری ہے:
ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی — سیدہ بانو افتخار حسین — 5

جنگ آزادی اور خواتین

پیکر عظمت و استقامت: بیگم حضرت محل — سفینہ سماوی — 9
آزادی کی جدوجہد اور خواتین — آصفہ زینب — 13
جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا کردار — صبی جی — 16
تحریک آزادی کی اہم خواتین رہنما — نگہت — 22
قائدانہ پیکر کی مثال بی اماں — تبسم آرا — 26
پھولو اور جھانو مرمو: سنتھال بغاوت 1855 — شگوفہ تہذیب — 30

جہان نسواں

صالحہ عابد حسین: سلسلۂ روز و شب کے جھروکے سے — روشنی خان — 33
عہد حاضر میں نظم نگار خواتین — عاتکہ ماہین — 39
فاطمہ شیخ: گمنامی سے ابھرتی ہوئی ایک عظیم سماجی آواز — راشدہ خاتون — 44
عوامی شاعر: بشیر بدر — گلفشاں انجم — 47

حسن سخن

نظم — عذرا نقوی — 50
غزل — ذاکرہ شبنم — 50

افسانے

سراب — یاسمین بانو — 51
مات — صاحبہ فردوس — 56
نیا بزنس — صاعقہ غیاث — 58

قارئین کے خطوط

ارتباط — 62

اُردھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 10 شمارہ: 8 اگست 2026

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65
نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 011-35151992
شعبۂ ادارت: 011-35152009
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون : 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

مشعل

ہر سال اگست کا مہینہ اپنی آمد کے ساتھ آزادی کی لازوال نعمت، اس کے لیے دی جانے والی بے شمار قربانیوں اور ان گنت جانبازوں کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کسی ایک دن یا کسی ایک طبقے کی جدوجہد کا ثمر نہیں، بلکہ یہ ایک طویل، صبر آزما اور ہمہ گیر تحریک کا حاصل ہے جس میں ملک کے ہر طبقے، ہر مذہب، ہر زبان اور ہر خطے کے لوگوں نے اپنی قربانیاں پیش کی ہیں۔ اس عظیم جدوجہد میں مردوں کے شانہ بشانہ خواتین نے بھی عزم، ہمت اور ایثار کا مظاہرہ کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ وطن کی محبت ہر باشعور انسان کا فطری جذبہ ہے۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ خواتین کی بے مثال قربانیوں، جرات اور استقامت کے تذکروں سے روشن ہے۔ جب بھی آزادی کی داستان رقم کی جائے گی تو بیگم حضرت محل کی بے خوف قیادت، رانی لکشمی بائی کی شجاعت، سروجنی نائیڈو کی سیاسی بصیرت، بی اماں کی قومی بیداری، کملا نہرو کی بے لوث خدمات، زلیخا بیگم کی جدوجہد اور بیگم حسرت موہانی کی قربانیاں سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔ ان خواتین نے اپنے گھروں کی چار دیواری تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ حالات کی سختیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آزادی کی تحریک کو نئی قوت، نئی سمت اور نئی روح عطا کی۔ اسی طرح ملک کے مختلف علاقوں میں بے شمار ایسی گمنام خواتین تھیں جنھوں نے خاموشی سے تحریکِ آزادی کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا، گرچہ تاریخ کے صفحات میں ان کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔

آزادی کے بعد بھی ہندوستانی خواتین نے اپنے عزم واستقلال کی نئی مثالیں قائم کیں۔ آج وہ تعلیم، تحقیق، سائنس، طب، عدلیہ، سیاست، صحافت، ادب، تجارت، دفاع، کھیل اور سماجی خدمات سمیت زندگی کے ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے خاندان کی تعمیر وتربیت میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں بلکہ ملک کی ترقی، خوش حالی اور استحکام کے سفر میں بھی مردوں کے شانہ بشانہ اپنی ذمے داریاں نبھا رہی ہیں۔ جدید ہندوستان کی ترقی کی کوئی داستان خواتین کی فعال شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کو ان عظیم خواتین کی جدوجہد سے روشناس کرائیں، تاکہ وہ جان سکے کہ آزادی ہمیں آسانی سے حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس کے لیے بے شمار قربانیاں دی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ آزادی اسی وقت بامعنی ہوتی ہے جب معاشرے میں خواتین کو عزت، مساوی درجے، تعلیم، تحفظ اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع ملیں۔

ماہنامہ 'خواتین دنیا' کا یہ خصوصی گوشہ ان تمام معروف وگمنام خواتین کے نام منسوب ہے جنھوں نے آزادیِ ہند کے حصول اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ یقیناً یہ خواتین ہمارے روشن ماضی کی امین، ہمارے حال کی قوت اور ہمارے مستقبل کی امید ہیں۔

آپ کا

شمس اقبال

سیدہ بانو افتخار حسین

اردو کی تہذیب اور شناخت کو برقرار رکھنا ضروری ہے: ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی

ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی علاقہ ودربھ کی خواتین نثر نگاروں میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ تحقیق و تدوین سے متعلق ان کی 22 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں 'مدحت الاختر شخص اور شاعر' 'مولانا ناطق گلاؤٹھوی حیات اور ادبی خدمات' 'جوش کی شاعرانہ عظمت'، 'رانا آرٹ: ایک مطالعہ'، 'اردو ادب اور ماحولیات'، 'ایک عرب جب اردو بولے' قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے 'نشیب و فراز' اور 'یہ ایک تبسم' کے عنوان سے شائع ہو کر قارئین کی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر سروشہ صاحبہ پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ رہی ہیں۔ انھوں نے ناگپور کے معروف تعلیمی ادارے وسنت راؤ نائیک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز کے شعبۂ اردو میں بحیثیت صدر اپنی کارکردگی انجام دی اور نومبر 2017 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔

ان کے افسانوں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ راشٹر سنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کے بی۔ اے کے نصاب میں ان کے افسانے شامل ہیں۔ جسے طلبا بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

س۔ب: (سیدہ بانو): سب سے پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئیں؟

س۔ن۔ق: (ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی): میں ایوت محل ضلع کے تعلقہ داروہ میں 15 نومبر 1957 کو پیدا ہوئی۔

س۔ب: اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں کچھ بتائیے؟

س۔ن۔ق: میری ابتدائی تعلیم میرے نانا جان کے چھوٹے سے گاؤں بوری عرب میں ہوئی۔ چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پانچویں جماعت سے میری تعلیم داروہ میں ہوئی۔ بی اے تک تعلیم داروہ میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم ناگپور میں حاصل کی۔

س۔ب: آپ نے کن اداروں میں اپنی خدمات انجام دیں؟

س۔ن۔ق: میں نے سب سے پہلے ناگپور کے ایل۔ اے۔ ڈی کالج میں 1985 سے 1987 تک تقریباً دو سال ملازمت کی۔ اس کے بعد 1987 سے 2017 تک وسنت راؤ نائیک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور میں تقریباً تیس سال کام کیا۔

س۔ب: آپ نے افسانہ نگاری کا آغاز کب کیا اور آپ کا پہلا افسانہ کب شائع ہوا؟

س۔ن۔ق: مجھے بچپن میں کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ والد صاحب ہمارے امتحانات ختم ہونے کے بعد گرمی کی چھٹیوں میں ہمارے پڑھنے کے لیے رام پور یو پی سے بذریعۂ پارسل کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں منگوایا کرتے تھے جو ذہن

میں جگہ بناتی گئیں۔ اس کے علاوہ اسکول میں جو مضامین اور خط دیے جاتے تھے وہ لکھے، جو میرے اساتذہ کو بہت پسند آتے تھے۔جس سے میرا حوصلہ بڑھتا گیا۔ابتدا میں میں نے چھوٹی چھوٹی تقریریں لکھیں جو پسند کی گئیں۔ میں نے اپنے لیے اور اپنی دوستوں کے لیے بھی تقریریں اور کچھ تحریر لکھیں۔ اسی مطالعے کے شوق کے چند سالوں بعد پتہ نہیں کیسے کہانی لکھنے کا جذبہ میرے اندر خود بہ خود پیدا ہو گیا۔

میری ابتدائی کہانیاں (1) کارٹونسٹ (2) غمزدہ (3) بکھرے بکھرے سے خیالات ،تھیں جو اسکول میگزین میں شائع ہوئی تھیں۔

س۔ب: آپ اپنے بچپن کا کوئی ایسا واقعہ بتائیں جس نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

س۔ن ۔ق: میری عمر تقریباً دس سال رہی ہوگی اس وقت میری والدہ صاحبہ شدید بیمار ہو گئیں ،وہ تقریباً دو سال تک بیمار رہیں۔ اس واقعے نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میری نانی (جنھیں ہم اماں کہتے تھے) امی جان کی تیمارداری میں جُٹی رہتیں، ابا جان ان کے علاج میں مصروف رہتے اور امی جان کو الگ الگ شہروں میں علاج کے لیے لے جاتے ۔میرے دو بھائی اور تین بہنیں ہیں ۔امی جان کی علالت کے وقت میرا چھوٹا بھائی صرف چار ماہ کا تھا۔ میرے بڑے بھائی مجھ سے تقریبا ڈیڑھ سال بڑے ہیں۔ میں نے اور انھوں نے مل کر اس دوران اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو بڑے پیار سے سنبھالا۔ ہم دونوں اسی وقت سے ان کے لیے ماں باپ بن گئے اور وہ اب تک ہمیں اپنے والدین کا ہی درجہ دیتے ہیں اور ہم بھی اب تک انھیں وہی محسوس کرواتے ہیں۔

س۔ب۔ طالب علمی کے زمانے میں آپ کن افسانہ نگاروں سے متاثر تھیں؟

س۔ن ۔ق: میں خاص طور پر یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں کن افسانہ نگاروں سے متاثر تھی کیونکہ میرے بڑے بھائی ایڈوکیٹ اطیب الدین قاضی کو بچپن سے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ان کا میڈیم مراٹھی تھا۔ ہندی اور انگریزی سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ وہ کئی لائبریریوں سے کتابیں لایا کرتے تھے۔ انھیں کی وجہ سے میں نے ہندی، مراٹھی یہاں تک کہ انگریزی کے بھی کئی ناول پڑھے اور ساتھ ہی ساتھ اردو کی بھی کتابیں پڑھتی رہی۔ بھائی جان نے ہی کتابیں پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک مجھ میں بھر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ جنون ہر قسم کی کتابوں کے مطالعے کی طرف بڑھتا گیا۔ بڑے بھائی جان اور میں جس لائبریری کی کتابیں پڑھنا شروع کرتے چند مہینوں میں یہ نوبت آ جاتی کہ وہاں کی تمام کتابیں ہم پڑھ چکے ہوتے اور ہمارے پڑھنے کے لیے وہاں کچھ باقی نہیں رہتا۔

اس کے علاوہ میں اپنے کالج کی لائبریری سے اردو کی بہت سی کتابیں بھی پڑھتی چلی گئی جن میں باغ و بہار، سب رس، امراؤ جان ادا، عظیم شعرا کے دیوان، ابن صفی کے تمام جاسوسی ناول، منشی پریم چند، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، مولانا ابوالکلام آزاد، مشتاق احمد یوسفی، منور رانا وغیرہ کی کتابیں زیر مطالعہ رہی ہیں۔ ان سب کے علاوہ بھی اور بہت سے نام ہیں جنھیں درج کروں تو کئی صفات درکار ہوں گے۔

س۔ب: افسانہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

س۔ن ۔ق: افسانہ ایک فن ہے۔ ہر فن کار کو اپنے فن کے اظہار کے لیے ایک وسیلہ چاہیے افسانہ بھی فنکار کے لیے ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کر سکے۔

س۔ب: آپ کے خیال میں ایک اچھے افسانے کے ضروری عناصر کیا ہیں؟

س۔ن ۔ق: اچھے افسانے کے ضروری عناصر ہیں ۔دلچسپ کردار ، انوکھا پلاٹ ،جذباتی تاثر، تجسّس اور زندگی سے جڑا کوئی پیغام یا سبق۔

س۔ب: عصر حاضر میں کوئی ایسی افسانہ نگار خاتون جسے آپ پڑھنا پسند کرتی ہوں؟

س۔ن ۔ق: میرے مطالعے کا دائرہ کبھی کسی ایک فنکار پر ٹکا نہیں رہا۔ میں نئے سے نئے اور ابھی ابھی لکھنا شروع کرنے والے افسانہ نگار تک کو پڑھتی ہوں۔

س۔ب: آج کے دور کے مطابق لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا یا معاشی طور پر خود کفیل ہونا کتنا ضروری ہے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

> **"ادب اور زندگی کا ایک دوسرے سے گھرا رشتہ ھے۔ زندگی سماج سے جڑی ہوئی ھے۔ ادب کے ذریعے سماج کو بدلا جا سکتا ھے۔ ادب سماج پر پوری طرح اثر انداز ہو سکتا ھے۔ ادب کے ذریعے سماج کو سدھارا جا سکتا ھے بھتر بنایا جاسکتا ھے"**

س۔ن۔ق: میرے خیال میں لڑکیوں کا ہر دور میں تعلیم حاصل کرنا اور خود کفیل ہونا ضروری تھا، ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

س۔ب: کیا ادب کے ذریعے سماج کو بدلنے اور سماج پر اثر انداز ہونے کے امکانات باقی ہیں؟

س۔ن۔ق: ادب اور زندگی کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے۔ ادب کے ذریعے سماج کو بدلا جا سکتا ہے۔ ادب سماج پر پوری طرح اثر انداز ہوسکتا ہے۔ ادب کے ذریعے سماج کو سدھارا جا سکتا ہے اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

س۔ب: آپ اپنے افسانے کے موضوعات کہاں سے لیتی ہیں؟

س۔ن۔ق: میں نے گرد وپیش کی زندگی اور روزمرہ موضوعات کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ میرے پیش کردہ کردار ہمارے ہی اردگرد کے اور شب و روز ہماری نظروں کے سامنے رونما ہونے والے واقعات ہیں۔ روزمرہ کے واقعات جو میرے حساس دل کو متاثر کرتے ہیں انھیں ہی میں افسانوں کے روپ میں پیش کر دیتی ہوں۔

س۔ب: ادب کے علاوہ آپ کی کوئی اور دلچسپی؟

س۔ن۔ق: ہر طرح کے آرٹ اور فن کی میں دلدادہ ہوں اور ہر طرح کے آرٹسٹ یا فنکار کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ کھیلوں سے بھی مجھے دلچسپی ہے۔ بہترین گیت اور موسیقی بھی میں بڑے شوق سے سننا پسند کرتی ہوں۔ میں اچھی فلمیں بھی دیکھتی ہوں۔ مشاعروں سے بھی مجھے دلچسپی ہے۔ اچھی تقریریں بھی سنتی ہوں۔ غزلیں بھی سنتی ہوں اور سب سے دلچسپ شوق بچوں کے ساتھ بچہ بن کر گھل مل جانا، ان کو خوش کرنا، ان کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنا، ان کی پسند کے پکوان بنا کر انھیں کھلانا مجھے بے حد پسند ہے۔

س۔ب: عمر کی اس منزل پر آپ کی کوئی خواہش جو پوری نہ ہوسکی ہو؟

س۔ن۔ق: میری کوئی خواہش ادھوری رہ گئی ہو ایسا مجھے تو کبھی محسوس نہیں ہوا۔ میں اپنی زندگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔

س۔ب: کسی بھی ادیب یا فنکار کے لیے انعامات کتنی اہمیت رکھتے ہیں؟

س۔ن۔ق: جس طرح ایک طالب علم کو امتحان کی خوب محنت، لگن اور جانفشانی سے تیاری کے بعد اچھے نمبر کا انتظار ہوتا ہے اسی طرح ایک فنکار کو بھی خوب محنت، لگن اور جانفشانی سے اپنے فن کو پیش کرنے کے بعد انعام کا یا قدردانی کا انتظار ہوتا ہے۔ انعام ملنے سے اس کا حوصلہ بڑھتا ہے اور اس کے دل میں کچھ نیا، کچھ بہتر کر دکھانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے حوصلوں کو اڑان مل جاتی ہے اور وہ زیادہ بلندیوں اور اونچائیوں کو چھونے کی کوشش میں جٹ جاتا ہے۔

س۔ب: آپ کے افسانے 'وحشت زدہ' میں جنس اور جنسی نفسیات شامل ہیں۔ خود محترم منور رانا صاحب نے لکھا ہے کہ اس افسانے میں منٹو سے عصمت آپا ہاتھ ملاتی نظر آتی ہیں اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

س۔ن۔ق: محترم منور رانا صاحب کا میرے افسانوں کے لیے ایسا کہنا نہایت فخر کی بات ہے۔ ناگپور شہر کا ہی یہ واقعہ ہے جس کے چرچے کئی مہینوں تک لوگوں کی زبان پر، اخبار کی سرخیوں میں، ٹی وی نیوز میں ہوتے رہے۔ یہ واقعہ جس گھر میں ہوا تھا اس کے پڑوس میں رہنے والی میری فرینڈ نے مجھے بتایا تھا۔ اس نے یہ پورا

واقعہ اپنی نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور میں نے اس پورے واقعہ کو پوری دیانت داری اور سچائی کے ساتھ افسانے کے انداز میں صفحۂ قرطاس پر اتارا تھا۔

"افسانے میں تہذیب کی اہمیت اس لیے ہے کیونکہ یہ کہانی کو ایک خاص ماحول اور پس منظر عطا کرتی ہے، کرداروں کے جذبات اور رشتے سمجھنے میں مدد کرتی ہے اور قارئین کو ایک الگ دنیا سے جوڑتی ہے۔ جس سے کہانی میں گہرائی اور اصلیت پیدا ہوتی ہے۔"

اب چونکہ میں نے منٹو اور عصمت چغتائی کو بہت پڑھا ہے تو کچھ تو میری تحریر پر بھی ان کا اثر پڑا ہی ہوگا۔ اس لیے شاید رانا صاحب کو ایسا محسوس ہوا ہو۔

س۔ب: آپ نے اپنے افسانے ''آخری سفر'' اور ''جینے کی نئی راہ'' میں مختلف تہذیب اور عقیدے کا بخوبی ذکر کیا ہے آپ کے نزدیک تہذیب کیا ہے اور افسانے میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

س۔ن۔ق: تہذیب یعنی کلچر، روایات اور شائستگی کا عکس۔ افسانے میں تہذیب کی اہمیت اس لیے ہے کیونکہ یہ کہانی کو ایک خاص ماحول اور پس منظر عطا کرتی ہے، کرداروں کے جذبات اور رشتے سمجھنے میں مدد کرتی ہے اور قارئین کو ایک الگ دنیا سے جوڑتی ہے۔جس سے کہانی میں گہرائی اور اصلیت پیدا ہوتی ہے۔

س۔ب: آپ اپنی تخلیقات میں کسے شاہکار سمجھتی ہیں؟

س۔ن۔ق: ہر فنکار یا آرٹسٹ کو اپنی تخلیق سے بہت پیار ہوتا ہے اور وہ اپنی ہر تخلیق کو شاہکار سمجھتا ہے کیونکہ ہر تخلیق کے لیے اس نے بہت محنت کی ہوتی ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ ایک فنکار کو اپنا فن قارئین کے سپرد کر کے اس کے بعد جو داد ملتی ہے وہی اس کے لیے سب سے بڑا انعام ہوتی ہے۔

میں اپنی کسی بھی تخلیق کو شاہکار نہیں سمجھتی بس ہر فن کو فن پارہ بنانے کے لیے جی توڑ محنت ضرور کرتی ہوں۔

س۔ب: اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

س۔ن۔ق: میرے خیال میں اردو کا مستقبل کافی روشن ہے خاص طور پر جوان نسل کے درمیان اردو کی جو مقبولیت ہے وہ واقعی خوش کن ہے۔ اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ ایک تہذیب، ایک کلچر ہے۔ اردو کا ادب، اردو کی شاعری اور خاص طور پر اردو غزل سبھی کو بہت پسند آتی ہے اردو زبان معاشرے کو جوڑ کر رکھتی ہے۔

اردو کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے ہم سب کو ایک جٹ ہو کر کام کرنا ہوگا۔ اردو کی تہذیب اور شناخت کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اردو کو سوشل میڈیا کے ذریعے فروغ دینا ہوگا۔ اردو کو تعلیم، تحقیق، سائنس اور تکنیک کا حصہ بنانا ہوگا۔ نئے شعرا اور مصنفین کو منظر عام پر لانا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اردو زبان سے جوڑنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اردو ادب کو ڈیجیٹل فضا میں بڑھانا ہوگا اور ایسے کئی کام ہیں جنھیں ہم اردو کے فروغ کے لیے عمل میں لا سکتے ہیں۔

س۔ب: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کی ترویج وترقی کے لیے جو کوشش کی ہیں ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

س۔ن۔ق: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کی ترویج وترقی میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ جو بھی کر رہے ہیں اس سے اردو زبان کی ترویج وترقی تو ہو رہی ہے اسی کے ساتھ اردو کے شاعروں، ادیبوں، فنکاروں، اسکول، کالج اور اداروں کی بھی مالی امداد ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ قومی کونسل کی بہترین کارکردگی ہے۔

❒❖❒

Saiyada Bano Iftekhar Husain
Research Scholar
Vasantrao Naik Government Institute of Art And Social Sciences
Husainabad Haidery Chowk Muzahid Kirana Store
Kamptee-440001(M.S)

پیکر عظمت و استقامت
بیگم حضرت محل

سفینہ سماوی

بیگم حضرت محل کا شمار ہندوستان کی ان نامور شخصیات میں ہوتا ہے جن کی شجاعت اور قربانی سے تاریخ کے اوراق روشن ہیں۔ 1857 کے غدر کے دوران بیگم حضرت محل نے جس جانبازی، حکمت عملی اور وطن سے بے لوث محبت کا ثبوت دیا وہ قابل تعریف ہے۔ وہ ایک باہمت اور دلیر خاتون تھیں۔ انھوں نے ایسے مشکل وقت میں جب کہ ریاست اودھ انگریزوں کے جبر وتشدد کا شکار ہو رہی تھی ہمت نہیں ہاری اور انگریزوں کی شاطرانہ سیاست سے زبردست ٹکر لی۔ ان کی حکمت عملی اور انتظامی صلاحیتوں نے عوام کو قائل کیا اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں عوام ان کے ساتھ ہوگئی۔ انھوں نے ملک کے تحفظ کے لیے بہت کوششیں کیں اور ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ آگے بڑھیں۔ بیگم حضرت محل 1857 کی جنگ آزادی میں اودھ میں برطانوی حکومت کے خلاف مزاحمت کی ایک اہم رہنما تھیں۔ اپنے شوہر نواب واجد علی شاہ کی جلاوطنی کے بعد انھوں نے بغاوت کی قیادت سنبھالی، لکھنؤ کے دفاع کی ذمے داری اٹھائی اور اپنے بیٹے برجیس قدر کو اودھ کا حکمران قرار دیا۔ ان کی بہادری، عزم اور قائدانہ صلاحیت نے انھیں برطانوی استعمار کے خلاف مزاحمت کی علامت اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں خواتین کی قیادت کی ایک دائمی مثال بنا دیا۔

بیگم حضرت محل کے بچپن کا نام محمدی خانم تھا۔ چند مصنف اس سے اختلاف کرتے ہوئے ان کا نام امراؤ بیگم بھی بتاتے ہیں۔ وہ اودھ کے نواب واجد علی شاہ کے ولی عہدی کے زمانے میں ہی ان کے موسیقی اسکول جس کو 'پری خانہ' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، داخل ہوئیں۔ واجد علی شاہ نے انھیں 'مہک پری' کا خطاب عطا کیا۔ بعد ازاں نواب نے ان سے عقد کر لیا۔ جب وہ حاملہ ہوئیں اس وقت واجد علی شاہ نے انھیں 'افتخار النسا' کے خطاب سے نوازا۔ اس کے بعد 1847 میں جب واجد علی شاہ اودھ کے نواب بنے تو انھوں نے افتخار النسا کو 'حضرت محل' کا خطاب دیا۔ ان کی رہائش قیصر باغ کے پیچھے ایک خوبصورت مکان میں تھی۔

نواب اودھ امجد علی شاہ کے صاحبزادے واجد علی شاہ، اودھ کے گیارہویں اور آخری نواب تھے۔ انھوں نے 1847 سے 1856 تک اودھ پر حکومت کی۔ سیاسی حیثیت کے علاوہ، واجد علی شاہ فنون لطیفہ کے عظیم سرپرست تھے۔ انھوں نے رقص، شاعری، موسیقی اور اودھ کی ثقافتی روایات کے فروغ میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے انتظامی بدعنوانی اور بدانتظامی کا الزام عائد کرتے ہوئے اودھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اودھ کے الحاق کے بعد واجد علی شاہ کو کلکتہ جلاوطن کر دیا گیا، جہاں وہ برطانوی حکومت کی نگرانی میں 1887 (تا وفات) تک مقیم رہے۔

اپنے شوہر کی جلاوطنی کے بعد بیگم حضرت محل نے برطانوی اقتدار کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ لکھنؤ میں رہیں اور مزاحمتی تحریک کی قیادت سنبھالی۔ واجد علی شاہ کلکتہ کے مٹیا برج نامی جگہ پر منتقل کیے گئے تھے جہاں انھوں نے ایک نیا لکھنؤ آباد کر رکھا

اپنے شوہر کی جلاوطنی کے بعد بیگم حضرت محل نے برطانوی اقتدار کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ لکھنؤ میں رہیں اور مزاحمتی تحریک کی قیادت سنبھالی۔واجد علی شاہ کلکتہ کے مٹیا برج نامی جگہ پر منتقل کیے گئے تھے جہاں انھوں نے ایک نیا لکھنؤ آباد کر رکھا تھا۔ لیکن بیگم حضرت محل نے لکھنؤ چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

تھا۔لیکن بیگم حضرت محل نے لکھنؤ چھوڑنا گوارا نہ کیا۔انھوں نے اپنی ذہانت و ذکاوت کو بروئے کار لاکر اپنے دس سالہ صاحبزادے، برجیس قدر کے قائم مقام کے طور پر ریاست کا نظم ونسق اپنے ہاتھوں میں لے کر آٹھ مہینوں تک حکومت کی اور برطانوی افواج کے خلاف دفاعی جدوجہد کی قیادت کی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے سب سے پہلے عام بھرتی کا اعلان کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پرانے سپاہی انگریزوں کے ماتحت ہو گئے تھے۔انھوں نے تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے نام احکام جاری کیے کہ ان کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کریں۔ ان کی حوصلہ افزائی پر عوام میں ان کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ کے لیے جوش وخروش پیدا ہوا۔اودھ کے باشندے جن کے دل میں آزادی کی آگ جل رہی تھی، وہ بھی اب تک کسی قیادت کے منتظر تھے۔ جب انھیں بیگم حضرت محل کا ساتھ ملا تو غدر کے شعلے میرٹھ، دلی، آرا وغیرہ کے ساتھ ساتھ اودھ میں بھڑک اٹھے۔اس طرح اودھ اور اس کے گردو نواح کے علاقے میں آزادی کی جد و جہد ایسی تیز ہوئی کہ عورتیں بھی مردانہ لباس میں نکل پڑیں اور ملک کے لیے جنگ کرنے سے بالکل پیچھے نہ ہٹیں۔ بیگم حضرت محل نے بہادروں کو اپنے ساتھ ملا کر فوج بنائی اور ان کی فوج نے تقریباً چھ مہینے تک لکھنؤ شہر کو انگریزوں سے محفوظ رکھا۔اسی کے ساتھ ہی فوج نے تیرہ ہفتوں کے قریب انگریز ریزیڈنسی کا محاصرہ کرتے رہے۔ یہ مشکل مہم صرف بیگم حضرت محل کی قیادت کے سبب ممکن ہوسکی۔ اس ضمن میں انیس فاطمہ بریلوی بیگم حضرت محل کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''حضرت محل کے تدبر، اعلیٰ دماغی قابلیت اور استقامت نیز مموخاں اور مولوی احمد اللہ شاہ کی حسن تدبیر نے تحریک کو اس کامیابی سے چلایا کہ مدت کی سپاہیانہ زندگی سے علیحدگی نے طبیعتوں میں جو بے حسی اور جمود پیدا کر دیا تھا وہ یکدم رخصت ہو گیا۔ جو ہتھیار زنگ آلود ہو کر بے کار ہو گئے تھے، وہ صیقل کیے گئے۔ ان کی جھنکار فضائے آسمانی میں گونج کر ریخ بستہ دلوں کو پھر گرمانے لگی۔''[1]

بیگم حضرت محل کی مزاحمت اپنے زمانے کی روایتی حدود سے کہیں آگے تھی۔ ایک خاتون رہنما کی حیثیت سے ان کا ابھرنا اس دور کے مردانہ سماجی نظام کے لیے ایک چیلنج تھا۔ ان کی بہادری، استقلال اور ناقابل تسخیر حالات میں ثابت قدمی نے انھیں برطانوی استعمار کے خلاف مزاحمت کی ایک مضبوط علامت بنا دیا۔ ان کی جدوجہد نے نہ صرف اہل اودھ کو حوصلہ بخشا بلکہ ہندوستان بھر میں آزادی کے متلاشی افراد کو بھی امید، عزم اور نئی توانائی عطا کی۔

بیگم حضرت محل کی جدوجہد نے اس وقت کی طاقتور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو شدید چیلنج سے دوچار کر دیا۔ ان کی قیادت اور اودھ کی بغاوت نے برطانوی حکومت کی کمزوریوں کو آشکار کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانی عوام خاموشی سے غلامی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس بغاوت کے نتیجے میں برطانوی حکومت کو اپنی نوآبادیاتی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنا پڑی اور وہ برصغیر پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے کی کوششیں کرنے پر مجبور ہو گئے۔

بیگم حضرت محل کی مزاحمت نے سماجی، معاشی اور مذہبی تفریق سے بالاتر ہو کر عوام کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا۔ انھوں نے مسلمانوں، ہندوؤں اور دیگر برادریوں کو ایک مشترکہ دشمن، یعنی برطانوی استعمار، کے خلاف یکجا کیا۔ اس اتحاد نے نہ صرف قومی یکجہتی کو مضبوط کیا بلکہ برطانوی اقتدار کے خلاف ایک منظم اور ہم آہنگ تحریک کی بنیاد بھی رکھی۔ انھوں نے آزادی کے شیدائیوں کی

قیادت کرتے ہوئے متعدد اہم جنگوں میں حصہ لیا۔ تاریخی شواہد ان کی بے مثال بہادری اور عسکری صلاحیتوں کی گواہی دیتے ہیں۔

بیگم حضرت محل برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم اور ناانصافیوں کے خلاف ایک طاقتور آواز بن کر ابھریں۔ اودھ کے داخلی معاملات میں برطانوی مداخلت اور مقامی عوام کے جذبات سے بے اعتنائی نے عوامی غم و غصے کو جنم دیا جس کے نتیجے میں بغاوت نے زور پکڑا۔ ان کی جدوجہد نے ان تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی نئی روح پھونک دی جو برطانوی استحصال اور ظلم کا شکار تھے۔ ان کی کوششوں نے مزید مزاحمتی تحریکوں کو جنم دیا اور عوام کی توجہ ان ناانصافیوں کی طرف مبذول کرائی، جس سے آزادی کی جدوجہد کو نئی قوت اور وسعت حاصل ہوئی۔

1856 میں جب لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں پر قبضہ کرلیا اور اس کے بعد اودھ کو بھی اپنی حکومت میں شامل کرنے کی کوششیں تیز کردیں تب انگریزوں کے خلاف احتجاج کی شروعات ہوئی۔ اس وقت اودھ کو انگریزوں کے تسلط سے محفوظ رکھنا بیگم حضرت محل کا نصب العین تھا۔ ان کے سیاسی شعور کی بالیدگی اور ملک کے تحفظ کے لیے ان کے ذریعے کیے گئے فیصلوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایک مدبر اور ماہر سیاست داں موجود تھا۔ انھوں نے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف لکھنؤ شہر کے تحفظ کے لیے شہر کے چاروں طرف ایک دیوار تعمیر کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے دیے۔ انھوں نے اپنی حکمت عملی اور ذہانت سے کانپور کے سپاہیوں کو، جو انگریز فوج میں شامل تھے، ان کو اپنی فوج میں شامل ہونے کے لیے راضی کرلیا۔ اس قسم کے کئی سیاسی فیصلے ان کی حکمت عملی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

5 جولائی 1857 احمد حسن کی تحریک اور نواب محمد خاں کی تائید سے حضرت محل کے بیٹے برجیس قدر تخت شاہی پر بیٹھے اور بیگم حضرت محل مشیر خاص قرار دی گئیں۔ راجہ جے لال سنگھ نے قیصر باغ کی بارہ دری کے تہہ خانوں میں ہندوستانی فوج کے لیے اناج بھروا دیا۔ اس کے بعد ریزیڈنسی پر سخت حملے شروع کیے گئے جن سے انگریزوں کو بہت نقصان ہوا لیکن سپاہی ریزیڈنسی کو تسخیر نہ کرسکے۔ یہ جنگ تقریباً تین مہینوں تک چلی جس میں ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کو سکون نہیں لینے دیا۔ لیکن اس کے بعد نئے انگریز افسران لکھنؤ آئے اور 23 ستمبر 1857 کی رات کو عالم باغ کی ہندوستانی چوکی پر حملہ کرکے چوکی کے آدھے سپاہیوں کو شہید کردیا۔ اس کے بعد کچھ منافقین کی مدد سے عالم باغ پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا گیا۔ بعد ازاں بیگم حضرت محل کی قیادت میں موتی محل، خورشید منزل اور قیصر باغ کی ہندوستانی فوج کی توپوں نے انگریزوں پر جم کر گولہ باری کی کہ ان کی ہمت پست ہوگئی۔ اس معرکے میں جنرل نیل ہلاک ہوگیا۔ انگریز سپاہیوں نے اپنی جان بچاتے ہوئے ریزیڈنسی میں پناہ لی۔ اس کے بعد سے جنگوں کا سلسلہ الگ الگ مقام پر جاری رہا۔

بیگم حضرت محل نے غیر معمولی قائدانہ صلاحیت، عسکری حکمت عملی اور انتظامی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انقلابی افواج کو منظم کیا اور 1858 میں برطانوی فوج سے سخت مقابلہ کیا اور لکھنؤ پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی

کافی جدوجہد کے بعد ہندوستانی سپاہی اودھ کو انگریزوں کے تسلط سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ انگریزوں کے پاس جدید اسلحے اور طاقتور فوج تھی اور بیگم حضرت محل کے پاس سپاہیوں کی تعداد کم ہونے کے ساتھ ہی ملک کے غدار بھی تھے جنھوں نے ہر اہم خبر انگریزوں کو دی جس سے ہندوستانی سپاہیوں کے حوصلے کو شدید جھٹکا لگا۔ لکھنؤ پر جب انگریزوں نے قبضہ کرلیا تو ان کی سب سے بڑی دشمن بیگم حضرت محل بن گئیں۔ حالات جب خراب ہونے لگے تب بھی انھوں نے جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور بڑی تعداد میں اپنے ساتھیوں، فوجیوں اور خیر خواہوں کے ساتھ گنگا کے پار ضلع بہرائچ کے بونڈی کے قلعہ میں پناہ لی۔

بیگم حضرت محل نے غیر معمولی قائدانہ صلاحیت، عسکری حکمت عملی اور انتظامی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انقلابی افواج کو منظّم کیا اور 1858 میں برطانوی فوج سے سخت مقابلہ کیا اور لکھنؤ پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کی جدوجہد نہ صرف برطانوی حکومت بلکہ اس دور کے مردانہ غلبے پر مبنی سماجی تصورات کے خلاف بھی ایک مضبوط آواز تھی۔ وہ قومی مزاحمت کی علامت اور آزادی کی امید بن گئیں۔ اسی دوران برطانوی ملکہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ جنگ بند کر دیں اور حکومت برطانیہ اس کے بدلے انھیں شاہی عیش و آرام اور پینشن دے گی۔ لیکن یہاں بھی بیگم حضرت محل نے اپنی ذکاوت کا ثبوت دیا اور سپاہیوں کو اس بات سے آگاہ کیا کہ یہ صرف انگریزوں کی ایک سازش ہے۔ اس وقت بیگم حضرت محل پر سب سے مشکل وقت گزر رہا تھا۔ ان کی فوج شکست کے قریب تھی لیکن انھوں نے برطانوی حکومت کے آگے جھکنا منظور نہیں کیا۔ حالانکہ ان کی قیادت میں اودھ کی افواج نے کئی ماہ تک بھرپور مزاحمت کی اور برطانوی اقتدار کو چیلنج کیا، لیکن بالآخر برطانوی افواج نے اودھ پر دوبارہ قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد دسمبر 1858 میں انھوں نے بونڈی کے قلعے سے کوچ کیا اور اپنے وفادار سپاہیوں کے ساتھ ہمالیہ کے ترائی علاقے سے ہوتی ہوئی گھنے جنگلوں کے درمیان سے نیپال پہنچیں۔ وہاں کے راجہ نے کچھ تامل کے ساتھ انھیں اپنے یہاں پناہ دی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام انھوں نے بہت مشکلوں میں گزارے لیکن کبھی ملک کے ساتھ غداری نہیں کی۔ 1874 میں کاٹھمانڈو میں ان کا انتقال ہوا۔

اگرچہ 1857 کی جنگ آزادی کامیاب نہ ہوسکی، لیکن بیگم حضرت محل کی کاوشیں فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ ان کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے حقوق کے لیے ڈٹ جانا اور مزاحمت کا جذبہ کبھی ترک نہ کرنا ہی حقیقی کامیابی ہے۔ بعد کی نسلوں کے آزادی کے شیدائیوں نے بھی ان کی جرأت، استقامت اور قربانی سے حوصلہ حاصل کیا اور آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھایا۔

1857 کی جنگ آزادی کے اہم دور میں اودھ کی اس بہادر رہنما نے نہ صرف برطانوی حکومت کو چیلنج کیا بلکہ معاشرے میں خواتین کے کردار سے متعلق روایتی تصورات کو بھی بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے مردوں کے شانہ بشانہ افواج کی قیادت کی اور عملی طور پر جنگ میں حصہ لیا۔ ان کی قیادت نے یہ ثابت کیا کہ خواتین صرف گھریلو ذمے داریوں تک محدود نہیں بلکہ قومی قیادت اور آزادی کی جدوجہد میں بھی نمایاں کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اگرچہ بغاوت ناکام رہی، مگر بیگم حضرت محل کی جرأت، استقلال اور قیادت خواتین کی طاقت اور حوصلے کی ایک نظیر بن گئی، جس نے آنے والی نسلوں کو مساوات، انصاف اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب دی۔

بیگم حضرت محل کی بہادری، ثابت قدمی اور اپنے وطن سے غیر متزلزل محبت آج بھی بے حد اہمیت کی حامل ہے اور انصاف و آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس طرح بیگم حضرت محل کا کردار ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں ہمیشہ ایک عظیم قومی رہنما، دلیر مجاہدہ اور خواتین کی قیادت کی لازوال علامت کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ ان کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ عزم، قربانی اور حب الوطنی کے ذریعے تاریخ کا رخ موڑا جاسکتا ہے، اور یہی ان کا سب سے بڑا تاریخی ورثہ ہے۔

حوالہ:

1 1857 کے ہیرو۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ۔ 1949۔ ص:32

2 جنگ آزادی 1857۔ ڈاکٹر تارا چند و ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف، مکتبہ برہان اردو بازار، دہلی۔ 1857۔ ص:279

❐❖❐

Dr. Safina Samavi
Assistant Professor
School of Humanities
Uttar Pradesh Rajarshi Tandon Open University
Prayagraj-211013(U.P)
Email:safinasamavi23@gmail.com

آصفہ زینب

آزادی کی جدوجہد اور خواتین

یہ حقیقت مسلم ہے کہ ہر زمانے میں خواتین نے مردوں کے قدم سے قدم ملا کر ہر طرح کے حالات میں ساتھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی یہاں کی خواتین پیچھے نہیں ہٹیں بلکہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ جنگ آزادی میں ان کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ خواتین کے دلوں میں جنگِ آزادی کا جذبہ بیدار کرنے میں سب سے اہم رول اخبارات و رسائل کا تھا۔ اخباروں کے ذریعے ملک اور قوم کی بیٹیوں کو جنگ میں شامل ہونے کے لیے جب آواز دی گئی تو انھوں نے لبیک کہا۔ خواتین کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبے کو بھڑکانے میں سب سے اہم رول بجنور سے نکلنے والا 'مدینہ' اخبار کا تھا۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں خواتین نے نہ صرف اپنے گھر کے مردوں یعنی بیٹوں اور شوہروں کو جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کیا بلکہ خود بھی ہر جگہ ان کی طاقت بن کر کھڑی رہیں۔ جنگِ آزادی میں خواتین کے اہم رول، ان کی اہمیت اور ان کی قربانیوں کو واضح کرتے ہوئے فضل حق عظیم آبادی اپنی کتاب 'خواتین ہند کے تاریخی کارنامے' میں لکھتے ہیں :

''اگر بیگم حسرت، بیگم آزاد اور کملا نہرو جیسی بیویاں نہیں ملتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے، مولانا آزاد الہلال اور البلاغ 'نکالتے رہتے اور جواہر لال ایک کامیاب بیرسٹر ہو کر رہ جاتے۔ یہ عورتیں وفا پرست اور ایثار مجسم تھیں جنھوں نے جان دے دی لیکن یہ کبھی نہیں پوچھا کہ لیلائے سیاست کے پرستارو، تم جیل جا رہے ہو میرا کیا ہوگا'' اس قول سے ثابت ہے کہ حسب بالا عورتوں اور ان جیسی متعدد دیگر عورتوں نے اپنے شوہروں کو آسمانِ سیاست کا روشن تارہ بننے میں جو اہم کردار ادا کیا وہ ہندوستانی عورتوں کے لیے شمع راہ ہے۔'' 1

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اس جدید دور میں خواتین مرد کے شانہ بہ شانہ کام کر رہی ہیں بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی جنگیں ہوئیں یا کسی طرح کی مصیبتیں آئی ہیں ہر جگہ خواتین مردوں کے ساتھ تھیں۔ حالات حاضرہ کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اس مضمون میں ہندوستان کی چند بہادر خواتین کے کارناموں کو پیش کیا جا رہا ہے تا کہ آنے والی نئی نسل کو ان کی جدوجہد اور قربانی کا اندازہ ہو اور ان سے استفادہ کر کے اپنے جذبے اور حوصلے کو مستحکم کر سکیں۔ فضل حق عظیم آبادی اپنی کتاب' خواتین ہند کے تاریخی کارنامے' جنگِ آزادی میں خواتین کارنامے کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مردوں کے ساتھ عورتیں بھی میدان جنگ میں کود پڑیں اور ان میں حب الوطنی و جانبازی کے جذبے یوں کارفرما

ہوئے کہ کئی جگہ انھوں نے مردوں سے زیادہ بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ویسے بھی ہزاروں عورتوں نے جہاں جیسی ضرورت پڑی اس کے مطابق کارنامے انجام دیے اور حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے زیادہ عورتوں کو نقصان اُٹھانا پڑا کیوں کہ انھوں نے ذاتی طور پر جو سزائیں بھگتیں وہ تو الگ تھیں۔ ان کے علاوہ کسی کا سہاگ لٹا، کسی کی گود خالی ہوئی، کسی کے گھر نظر آتش کیے گئے، کسی کے گھریلو سامان لٹے۔ اس طرح اس ملک کی خواتین نے جو قربانیاں دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔'' 2

رانی لکشمی بائی نے جب آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا تھاتو اس وقت وہ ایک کم عمر بیوہ تھیں۔ہم سب جانتے ہیں کہ اس زمانے میں خواتین اور خاص کر بیواؤں کی زندگی کس قدر کم اہمیت کی حامل ہوا کرتی تھی۔ ایسے نامساعد حالات میں رانی لکشمی بائی نے انگریز جیسی طاقت سے لڑنے کی ہمت کی اور 1958 میں بڑی بہادری کے ساتھ انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئیں۔اس طرح انھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک بہادر شیرنی کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائی

رانی لکشمی بائی نے جب آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا تھا تو اس وقت وہ ایک کم عمر بیوہ تھیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس زمانے میں خواتین اور خاص کر بیواؤں کی زندگی کس قدر کم اہمیت کی حامل ہوا کرتی تھی۔ ایسے نامساعد حالات میں رانی لکشمی بائی نے انگریز جیسی طاقت سے لڑنے کی ہمت کی اور 1958 میں بڑی بہادری کے ساتھ انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئیں۔ اس طرح انھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک بہادر شیرنی کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائی۔

جنگ آزادی میں حصہ لینے والی بہادر خواتین میں ایک اہم نام بیگم حضرت محل کا بھی ہے جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محلوں میں رہنے والی خاتون تھیں لیکن طبیعت سے بالکل عام اور سادہ تھیں۔ لیکن جب ملک کی بات آئی تو بلا جھجھک محل سے باہر نکل آئیں اور مردانہ وار بہادری کے ساتھ انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ ان کی اس بہادری کی تعریف کرتے ہوئے ایک انگریز مورخ نے لکھا تھا۔ ''وہ ایک بہادر اور ہمّتی خاتون تھیں۔ انھوں نے ہاتھی پر سوار ہو کر لکھنؤ ریزیڈنسی پر حملہ کر کے انگریز سپاہیوں کو ناکام بنا دیا۔''

ہندوستان کی جنگ آزادی میں جس طرح ہر طبقے، ہر مذہب اور پیشے سے منسلک مردوں نے حصہ لیا اسی طرح ہر پیشے، مذہب اور طبقے سے منسلک خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس میں ایک اہم نام عزیزن بائی کا ہے۔ عزیزن بائی کانپور کی مشہور رقاصہ تھیں۔ ان کے اندر وطن پر جان نچھاور کرنے کا ایسا جذبہ تھا کہ تاتیا ٹوپے صاحب نے ان کے اس جذبے کو دیکھتے ہوئے کہا کہ ''لڑائیاں صرف تلواروں ہی سے نہیں لڑی جاتیں، حکمت سے بھی لڑی جاتی ہیں۔ تم ایک رقاصہ کی حیثیت سے کانپور چھاؤنی کے افسران سے میل جول بڑھاؤ۔ جب وہ تم پر اعتماد کرنے لگیں تو ان کے راز حاصل کر کے ہمیں پہنچاؤ۔'' عزیزن بائی نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جلد ہی عزیزن بائی شک کے گھیرے میں آ گئیں اور انگریزوں نے انھیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ عزیزن بائی کو جب کمانڈر جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہیولاک نے بہت چاہا کہ وہ اپنی غلطی مان لے لیکن انھوں نے اپنی غلطی ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مجبور ہو کر انھیں گولی مارنے کا حکم دے دیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں ایک اور انقلابی خاتون مہارانی جھندا کا نام بھی سر فہرست ہے۔ انھیں پنجاب کی اولیں مجاہد خاتون کا شرف حاصل ہے۔ مہارانی انگریزوں کے سخت خلاف تھیں۔ انھیں معلوم تھا کہ ملک کو آزاد کرانے کے لیے عوام میں حب الوطنی کا جذبہ جگانا ضروری ہے اس لیے عوام کو بیدار کرنے میں لگی رہیں۔ انگریزوں نے مہارانی جھندا سے ریاست کے تمام حقوق چھین لیے اور ڈیڑھ لاکھ سالانہ پنشن مقرر کر کے حکومت سے بے دخل کر دیا۔

اس لیے مہارانی نے بغاوت کی آواز بلند کی۔ ان کی بہادری اور جنگی لیاقت کو انگریز بھی سلام کرتے تھے۔ لارڈ ڈلہوزی نے کہا تھا:

''ریاست کی ساری فوجی طاقت ملا کر بھی مہارانی جھندا کی طاقت سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ مہارانی جھندا ان سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔''3

ہندوستان کی خواتین اپنے ملک و ملت کی عزت و ناموس کے لیے ہمیشہ فعال رهی هیں۔ هندوستان کی آزادی میں خواتین کا ایک اهم کردار رہا ہے۔ان کی قربانیاں قابل تحسین هیں۔ وہ ہمت، حوصلے اور وطن سے والہانہ محبت کی وجہ سے تاریخ کے صفحے پر ہمیشہ زندہ رہیں گی

بات ہندوستان کی جنگ آزادی کی ہو اور بی اماں کے ذکر کے بغیر مکمل ہو یہ ناممکن ہے۔ گاندھی جی خود کو بی اماں کا تیسرا بیٹا کہا کرتے تھے۔ بی اماں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کی والدہ تھیں۔ بی اماں پہلی مسلم خاتون تھیں جو ہندوستان کی سیاست میں درخشاں ستاروں کے مانند چمکی تھیں۔ انھیں بہت سی باتوں میں اولیت کا درجہ حاصل تھا۔ انھوں نے جس طرح سے اپنے بچوں کی رگوں میں خون کی طرح انگریزوں کی نفرت شامل کردی تھی اس بات کی گواہ ہندوستان کی تاریخ ہے۔ اس طرح بہت سی ہندوستانی خواتین نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا جن کے کارناموں کو ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ ان گنت ایسی خواتین ہوں گی جن کے نام تاریخ کے صفحے پر درج نہیں ہے۔ ان کی قربانیاں کہیں ماضی کی دھندلکوں میں گم ہوگئی ہیں۔ سرتاج بانوں اپنی کتاب 'ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین' میں لکھتی ہیں:

''سیکڑوں اور مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ جن خواتین کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کی تفصیل دستیاب ہے اور جو غیر معروف ہیں، ان دونوں طرح کی خواتین کی حب الوطنی میں فرق نہیں۔ دونوں طرح کی خواتین نے ملک کی آزادی کو مقدّم رکھا۔ ان بہادر خواتین کے خود کے الفاظ سے بھی ان کی حب الوطنی اور جواں مردی کی شناخت ہوتی ہے۔ کرناٹک کے رَتور کی رانی چنمّا نے جنھیں ہندوستان کی اوّل خاتون مجاہدہ ہونے کا شرف حاصل ہے، انگریز کلکٹر کو جواب بھیجا تھا: ''رَتور آزاد ریاست ہے اور آزاد ہی رہے گی۔ ضروری ہوا تو ہم جنگ کریں گے مگر اپنی آزادی برقرار رکھیں گے۔'' انھیں معلوم تھا کہ اُن کے جواب سے مشتعل ہوکر انگریز ریاست پر حملہ کریں گے، اس لیے انھوں نے اپنی رعایا کو جنگ کے لیے تیار کرنے کے مقصد سے کہا: ''کمپنی سرکار ہم سے کتور چھین لینا چاہتی ہے۔ لیکن جب تک تمھاری رانی کی نسوں میں خون کی ایک بوند بھی باقی رہے گی۔ کتور کسی کے سامنے سر نہیں جھکائے گا۔ غلام ہونے سے مرجانا زیادہ اچھا ہے۔''4

مختصر یہ کہ ہندوستان کی خواتین اپنے ملک و ملت کی عزت و ناموس کے لیے ہمیشہ فعال رہی ہیں۔ ہندوستان کی آزادی میں خواتین کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ ان کی قربانیاں قابل تحسین ہیں۔ وہ ہمت، حوصلے اور وطن سے والہانہ محبت کی وجہ سے تاریخ کے صفحے پر ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

حوالے

1۔ فضل حق عظیم آبادی ''خواتین ہند کے تاریخی کارنامے'' ص 172
2۔ فضل حق عظیم آبادی ''خواتین ہند کے تاریخی کارنامے'' ص 113
3۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین، ڈاکٹر بانو سرتاج، ص 36
4۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین، ڈاکٹر بانو سرتاج، ص 15

❒❖❒

Dr. Asfa Zainab
D/o Late Abdul Moyeed Ahmad(Advocate)
Damodarpur. Pathantoli
P.O :Damodarpur P.S : Kanti
District Muzaffarpur-843113 (Bihar)

جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا کردار

صبی جی

ہندوستان کی جنگِ آزادی ایک طویل، ہمہ گیر اور تاریخی جدوجہد تھی جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔ ان خواتین میں مسلم خواتین کا کردار نہایت نمایاں، مؤثر اور قابلِ فخر ہے۔ انھوں نے نہ صرف میدانِ جنگ میں حصہ لیا بلکہ سیاسی شعور بیدار کرنے، انقلابی تحریکوں کی سرپرستی، مالی تعاون، تعلیمی اصلاحات، سماجی بیداری اور قومی اتحاد کو فروغ دینے میں بھی اہم خدمات انجام دیں۔ لیکن افسوس کہ تاریخی کتب میں ان کی خدمات کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ مستحق تھیں۔

ہندوستان میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے سترہویں صدی میں تجارت کے بہانے قدم رکھا، لیکن رفتہ رفتہ پورے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ انگریزوں کی ظالمانہ معاشی، سیاسی اور سماجی پالیسیوں کے خلاف عوام میں شدید بے چینی پیدا ہوئی، جس کا نتیجہ 1857 کی پہلی جنگِ آزادی کی صورت میں سامنے آیا۔ اگرچہ یہ جنگ ناکام ہوئی، لیکن اس نے آزادی کی ایسی شمع روشن کی جو 1947 میں آزادی کے حصول تک فروزاں رہی۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو تاریخی اعتبار سے دو نمایاں ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور 1857 کی جنگِ آزادی اور اس کے بعد کے زمانے پر محیط ہے، جب ملک کے مختلف حصوں میں برطانوی اقتدار کے خلاف مسلح مزاحمت اور عوامی بغاوتیں جاری تھیں۔ دوسرا دور وہ تھا جب برطانوی حکومت نے ہندوستان پر اپنا تسلط مستحکم کر لیا اور اس کے بعد آزادی کے حصول کے لیے سیاسی اور سماجی بنیادوں پر مختلف منظم تحریکیں وجود میں آئیں۔

مسلم خواتین نے دونوں ادوار میں اپنی صلاحیتوں اور حالات کے مطابق تحریکِ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ بعض خواتین نے میدانِ جنگ میں بہادری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا، بعض نے سیاسی قیادت اور حکمتِ عملی کے ذریعے تحریک کو تقویت بخشی، جبکہ دیگر نے سماجی، تعلیمی اور اصلاحی سرگرمیوں کے ذریعے قوم میں آزادی کا شعور بیدار کیا۔ ذیل میں چند نمایاں مسلم خواتین کا مختصر تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی صورت میں جنگِ آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

بیگم حضرت محل

1857 کی جنگِ آزادی میں جس مسلم خاتون کا نام سب سے نمایاں طور پر سامنے آتا ہے، وہ ''بیگم حضرت محل'' ہیں۔ ان کی جرأت، عزمِ راسخ اور غیر معمولی قائدانہ صلاحیتوں کا اعتراف دوستوں کے ساتھ ساتھ مخالفین

نے بھی کیا۔ جب انگریزوں نے ان کے شوہر ''نواب واجد علی شاہ'' کو معزول کر کے کلکتہ جلا وطن کر دیا تو بیگم حضرت محل نے ان کے ساتھ جانے کے بجائے لکھنؤ میں رہ کر انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی قیادت کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اپنی سیاسی بصیرت سے اپنے کم عمر بیٹے کو تختِ اودھ پر بٹھایا اور ریاستی امور کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ حکومت سنبھالتے ہی انھوں نے نئی فوج کی بھرتی کا اعلان کیا، کیونکہ سابقہ سپاہیوں کی بڑی تعداد انگریزوں کے ماتحت ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے تعلقہ داروں اور زمینداروں کو احکامات جاری کیے اور انھیں ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

''1857 کی جنگِ آزادی کے دوران دہلی کی ایک عمر رسیدہ بہادر خاتون بھی اپنی شجاعت کی وجہ سے مشہور تھیں، جنھیں 'سبز پوش خاتون' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ سبز رنگ کا برقع اوڑھے، گھوڑے پر سوار ہو کر عوام کو انگریزوں کے خلاف جہاد اور مزاحمت کی ترغیب دیتیں''

بیگم حضرت محل کی قیادت نے اہلِ اودھ کو ایک مضبوط رہنما فراہم کیا، جس کے نتیجے میں وہاں بھی جنگِ آزادی کی تحریک زور پکڑ گئی۔ اردگرد کے علاقوں میں آزادی کا جذبہ اس قدر بڑھا کہ خواتین نے بھی مردانہ لباس پہن کر ہتھیار اٹھائے اور انگریزوں کے خلاف میدانِ جنگ میں اتر آئیں۔

بیگم حضرت محل خود بھی مردانہ لباس زیب تن کر کے، سر پر پگڑی باندھے، ہاتھ میں تلوار لیے، گھوڑے پر سوار ہو کر نہایت جرأت کے ساتھ دشمن کی صفوں پر حملہ آور ہوتیں، جس سے ان کی صفیں درہم برہم ہو جاتیں۔

تاریخ میں یہ واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے کہ انگریزوں کے محکمۂ جاسوسی کے سربراہ ''میجر ولیم اسٹیفن رائے کیس ہڈسن''، جس نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے تین شہزادوں کو قتل کیا تھا، جب لکھنؤ پہنچا تو بیگم حضرت محل نے اپنی حکمتِ عملی کے ذریعے اسے گرفتار کر لیا اور بعد ازاں اسے سزائے موت دے دی۔ اس حوالے سے ''پرویز اشرفی'' یوں رقمطراز ہیں:

> ''تاریخ کا ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ جس میجر ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کے تین شہزادوں کا قتل کر کے اُن کا خون پیا تھا، اُس میجر ہڈسن کو لکھنؤ پہنچتے ہی بیگم حضرت محل نے اپنی جنگی حکمت عملی کا ثبوت دیتے ہوئے گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔''[1]

بیگم حضرت محل کی انگریزوں کے ساتھ آخری جنگ گومتی کے کنارے واقع موسیٰ باغ کے علاقے میں ہوئی، جس میں پچھتر ہزار سپاہی شہید ہو گئے۔ لیکن بیگم نے ہمت نہیں ہاری، وہ ثابت قدم رہیں۔ حالانکہ جنرل اوٹرم نے بارہا صلح کی پیشکش کی اور سالانہ وظیفہ کا وعدہ بھی کیا، لیکن بیگم حضرت محل نے ہر مرتبہ مسترد کیا اور مزاحمت جاری رکھی۔ حتیٰ کہ شکست کے باوجود انھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے، اور آخرکار وہ اپنے بیٹے برجیس قدر کے ساتھ نیپال چلی گئیں، جہاں انھوں نے اکیس سال گمنامی کی زندگی گزاری، اور 17 اپریل 1879 کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئیں۔

سبز پوش خاتون

1857 کی جنگِ آزادی کے دوران دہلی کی ایک عمر رسیدہ بہادر خاتون بھی اپنی شجاعت کی وجہ سے مشہور تھیں، جنھیں 'سبز پوش خاتون' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ سبز رنگ کا برقع اوڑھے، گھوڑے پر سوار ہو کر عوام کو انگریزوں کے خلاف جہاد اور مزاحمت کی ترغیب دیتیں۔ ان کی پُرجوش آواز پر لوگ ان کے ساتھ مل کر دشمن پر حملہ آور ہوتے، جبکہ وہ خود کبھی تلوار اور کبھی بندوق سے نہایت دلیری کے ساتھ لڑتیں اور دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دیتیں۔ اگر ان کے ساتھی میدان چھوڑ بھی دیتے تو وہ تنہا ہی لڑائی جاری رکھتیں اور ہر بار بحفاظت واپس آ جاتیں۔ تاہم ان کی اصل شناخت کیا تھی اور وہ جنگ کے بعد کہاں چلی جاتی تھیں، یہ ایک معمہ ہی رہا۔ بعض عینی شاہدین ان کی بہادری کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ:

''اس عورت میں غضب کی دلیری تھی۔ اس کو موت کا کچھ خوف نہ تھا۔ وہ گولوں اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر سپاہیوں کی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی۔ کبھی اس کو پیدل دیکھا جاتا، کبھی گھوڑے پر سوار، وہ تلوار اور بندوق چلانے میں ماہر تھی، اس کی جرأت و ہمت دیکھ کر شہر کے عوام میں بڑا جوش پیدا ہو جاتا تھا۔''2

اس خاتون کی بے مثال جرأت کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں بھی جذبۂ مزاحمت بیدار ہو جاتا تھا۔ آخر ایک روز جنگ کے دوران وہ دشمن کے مورچوں کے بہت قریب پہنچ گئیں اور شدید زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑیں۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے انھیں گرفتار کر لیا اور انبالہ جیل بھیج دیا۔

گرفتاری کے بعد سبز پوش خاتون کے ساتھ کیا پیش آیا، اس کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں۔ تاہم وہ اپنی غیر معمولی جرأت، بہادری اور جذبۂ آزادی کی ایسی مثال قائم کر گئیں جو ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

عزیزن

عزیزن کا تعلق ابتدا میں لکھنؤ سے تھا، لیکن بعد میں وہ کانپور منتقل ہو گئیں۔ برصغیر کی جنگِ آزادی میں ان کا کردار انتہائی قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے عیش و عشرت اور آرام دہ زندگی کو وطن کی محبت پر قربان کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ حب الوطنی ہر ذاتی آسائش سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ جب 1857 میں نانا صاحب پیشوا نے کانپور میں انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو عزیزن نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔

عزیزن غیر معمولی تنظیمی صلاحیت کی مالک تھیں۔ انھوں نے خواتین پر مشتمل ایک مختصر مگر منظم دستہ تشکیل دیا، جس کی ذمے داریاں زخمی مجاہدین کی تیمارداری، انھیں خوراک اور لباس کی فراہمی، نیز گولہ بارود کی رسد پہنچانا تھیں۔ اس کے علاوہ وہ 'انقلابی کمان' کی ایک سرگرم رکن بھی تھیں۔ نانا صاحب پیشوا، عظیم اللہ خان اور تانتیا ٹوپے کو ان کی وفاداری، جرأت اور صلاحیتوں پر مکمل اعتماد حاصل تھا۔

''عزیزن غیر معمولی تنظیمی صلاحیت کی مالک تھیں۔ انھوں نے خواتین پر مشتمل ایک مختصر مگر منظم دستہ تشکیل دیا، جس کی ذمے داریاں زخمی مجاہدین کی تیمارداری، انھیں خوراک اور لباس کی فراہمی، نیز گولہ بارود کی رسد پہنچانا تھیں۔ اس کے علاوہ وہ 'انقلابی کمان' کی ایک سرگرم رکن بھی تھیں۔ نانا صاحب پیشوا، عظیم اللہ خان اور تانتیا ٹوپے کو ان کی وفاداری، جرأت اور صلاحیتوں پر مکمل اعتماد حاصل تھا''

کانپور میں انقلابیوں کی شکست کے بعد جب انگریزوں نے باغیوں کی فہرست تیار کی تو عزیزن کا نام سرفہرست تھا۔ گرفتاری کے بعد انھیں جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کیا گیا تو جنرل نے انھیں یہ پیشکش کی کہ اگر وہ اپنا جرم تسلیم کر لیں تو انھیں معاف کر کے رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن عزیزن نے ہر قسم کی پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے انگریزوں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے نہایت دلیری کے ساتھ ''نانا صاحب زندہ باد'' کا نعرہ بلند کیا، جس پر جنرل ہیولاک نے سپاہیوں کو فائر کرنے کا حکم دے دیا۔ یوں عزیزن نے وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے شہادت کا عظیم مرتبہ حاصل کیا۔

بی اماں (آبادی بانو بیگم)

بی اماں، جن کا اصل نام 'آبادی بانو بیگم' تھا، برصغیر کے ممتاز رہنماؤں محمد علی جوہر اور شوکت علی کی والدہ تھیں۔ انھوں نے تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی میں نہایت سرگرم کردار ادا کیا۔ آزادیِ

وطن کے لیے ان کی وابستگی، جرأت اور قربانی کے جذبے نے انھیں ایک عظیم مجاہدۂ آزادی اور سچی محبِ وطن کے طور پر نمایاں کیا۔

بی اماں کی سیاسی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز پہلی جنگِ عظیم کے دوران ہوا، جب جنگی حالات کے پیشِ نظر حکومتِ برطانیہ نے ملک میں ''قانونِ تحفظِ ہند'' نافذ کیا۔ اس قانون کے تحت متعدد قومی رہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا، جن میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی بھی شامل تھے۔ انہی حالات میں نظر بند رہنماؤں کی حمایت اور ان کے مقدمات کی پیروی کے لیے ''انجمنِ نظر بندانِ اسلام'' قائم کی گئی، جس کے تحت ایک امدادی فنڈ تشکیل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ بی اماں نے اس فنڈ کے لیے فراخ دلی سے مالی تعاون کا اعلان کیا، جس سے ان کی قومی ہمدردی، سیاسی شعور اور تحریکِ آزادی سے گہری وابستگی نمایاں ہوتی ہے۔

30 دسمبر 1921 کو احمد آباد میں بی اماں کی صدارت میں ''کُل ہند زنانہ کانفرنس'' منعقد ہوئی، جس میں ملک بھر سے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی ہزاروں خواتین نے شرکت کی۔ ان میں نامور غیر مسلم خواتین میں کستوربا گاندھی، سروجنی نائیڈو، انوسیا بائی، چودھرائن اور سرلا دیوی شامل تھیں، جبکہ مسلم خواتین میں امجدی بیگم (اہلیہ مولانا محمد علی) شمس النساء بیگم، بیگم ڈاکٹر مختار احمد انصاری، نشاط النساء بیگم (اہلیہ مولانا حسرت موہانی) بیگم خورشید (اہلیہ خواجہ عبد المجید) اور بیگم سعادت بانو (اہلیہ سیف الدین کچلو) کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کانفرنس سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ تحریکِ آزادیِ ہند میں مسلم اور غیر مسلم خواتین نے مذہبی تفریق سے بالاتر ہو کر قومی جدوجہد میں نہایت جوش، ولولے اور یکجہتی کے ساتھ حصہ لیا، جس سے تحریکِ آزادی کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔

بی اماں نے عوامی اتحاد اور سیاسی بیداری کی ایسی فضا قائم کی

> **تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے دوران جہاں مہاتما گاندھی اور علی برادران نے بھرپور قیادت فراہم کی، وہیں بی اماں اور امجدی بیگم نے چندہ جمع کرنے کی ذمے داری سنبھال کر تحریک کو مضبوط مالی سہارا فراہم کیا۔ انہوں نے ملک بھر سے بڑی مقدار میں چندہ اکٹھا کیا، جس سے آزادی کی تحریک کو مالی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ امجدی بیگم نے چندہ جمع کرنے کے ساتھ خواتین میں سیاسی شعور بھی بیدار کیا اور انہیں مہاتما گاندھی کے اصولوں، خلافت تحریک اور قومی جدوجہد میں عملی شرکت کی ترغیب دی**

جس نے تحریکِ آزادی کو نئی سمت اور تقویت عطا کی۔ خواتین میں سیاسی شعور کی بیداری اور قومی جدوجہد میں ان کی فعال شرکت ایک جرأت مندانہ اور اہم قدم تھا۔ بالآخر یہ عظیم مجاہدہ 13 نومبر 1924 کو دہلی میں وفات پا گئیں اور یوں وہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

امجدی بیگم

'امجدی بیگم' کا نام بھی تحریکِ آزادی کی نمایاں خواتین میں شمار ہوتا ہے۔ وہ مولانا محمد علی جوہر کی اہلیہ تھیں اور ان کا تعلق رام پور کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ شادی کے بعد وہ اپنے

شوہر کے سیاسی و قومی مشن سے وابستہ ہوگئیں اور جنگِ آزادی کی جدوجہد میں ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا۔ چونکہ ان کی سسرال آزادیِ وطن کی جدوجہد کا سرگرم مرکز تھی، جہاں بی اماں اور ان کے دونوں بیٹے محمد علی جوہر اور شوکت علی قومی تحریک میں پیش پیش تھے، اس لیے امجدی بیگم کے اندر بھی خدمتِ وطن کا جذبہ پروان چڑھا۔ چنانچہ 1920 میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون کے آغاز پر انھوں نے عملی طور پر تحریکِ آزادی میں حصہ لیا اور ہر مرحلے پر اپنے شوہر کا بھرپور ساتھ دیا۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون کے دوران جہاں مہاتما گاندھی اور علی برادران نے بھرپور قیادت فراہم کی، وہیں بی اماں اور امجدی بیگم نے چندہ جمع کرنے کی ذمے داری سنبھال کر تحریک کو مضبوط مالی سہارا فراہم کیا۔ انھوں نے ملک بھر سے بڑی مقدار میں چندہ اکٹھا کیا، جس سے آزادی کی تحریک کو مالی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ امجدی بیگم نے چندہ جمع کرنے کے ساتھ خواتین میں سیاسی شعور بھی بیدار کیا اور انھیں مہاتما گاندھی کے اصولوں، خلافت تحریک اور قومی جدوجہد میں عملی شرکت کی ترغیب دی۔ 1921 میں انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں اتر پردیش کی نمائندگی کی اور ستیہ گرہ، غیر ملکی اشیا کے بائیکاٹ، شراب کی دکانوں کے سامنے احتجاج، فوجی بھرتی کی مخالفت اور سرکاری ملازمتوں سے استعفوں کی تحریک میں سرگرم کردار ادا کیا۔ انھی خدمات کے اعتراف میں مہاتما گاندھی نے ''ینگ انڈیا'' (29 نومبر 1921) میں ''بہادر خاتون'' کے عنوان سے ان کے متعلق ایک مضمون میں لکھا تھا:

> ''بیگم محمد علی کے ہمراہ کام کرتے ہوئے جو تجربات ہوئے اس میں میں قارئین کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ سال انھوں نے اپنے شوہر محمد علی کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ ابتدا، سمرنا فنڈ کے لیے چندہ وصول کرنے سے ہوئی۔ تب سے وہ ہمارے طویل اور دشوار ترین بہار، آسام، بنگال وغیرہ کے سفر میں شریک رہیں۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں تقریر کا ملکہ اپنے بہادر شوہر سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی تقاریر مختصر ہونے کے باوجود پُر اثر ہوتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی آزمائش اور اس میں فتح کا وقت وہ تھا جب ان کے شوہر کو والٹیر اسٹیشن پر ان سے چھین لیا گیا۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا وہ شوہر کی گرفتاری سے خوش ہیں تو انھوں نے برجستہ کہا ''یقیناً، وہ اپنے ملک و ملت کی خاطر جیل گئے ہیں۔'' ہم نے مدراس کا سفر جاری رکھا جہاں انھوں نے بھی عوام سے خطاب کیا اور میں یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ وہ صحیح معنوں میں بہادر شوہر کی بہادر بیوی ہیں۔''[3]

جنوری 1931ء میں مولانا محمد علی جوہر کے انتقال کے بعد بھی امجدی بیگم نے آزادی کی تحریک سے اپنا تعلق برقرار رکھا اور مسلسل قومی خدمت میں مصروف رہیں۔ تقریباً پندرہ سال تنہا زندگی گزارنے کے بعد 1946 میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات پر مہاتما گاندھی نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ملک ایک انتہائی نڈر و عظیم قوم پرست سے محروم ہوگیا۔''

نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی)

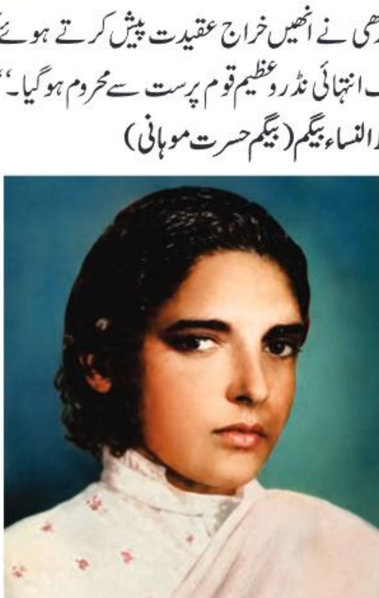

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی نمایاں اور باہمت خواتین میں بیگم حسرت موہانی کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا اصل نام 'نشاط النساء بیگم' تھا، تاہم مولانا حسرت موہانی سے شادی کے بعد وہ 'بیگم

حسرت موہانی' کے نام سے معروف ہوئیں۔ وہ ان عظیم خواتین میں شامل تھیں جنھوں نے اپنے شوہروں کی آزادیِ وطن کی جدوجہد میں ہر قدم پر بھرپور معاونت کی۔ جب حسرت موہانی انگریز حکومت کے خلاف اپنی تحریروں، تقاریر اور سیاسی سرگرمیوں کے باعث گرفتاریوں اور سختیوں کا سامنا کرتے رہے تو بیگم حسرت موہانی نے ان کا حوصلہ بلند رکھا اور ہر آزمائش میں ثابت قدمی سے ان کا ساتھ دیا۔

نشاط النساء بیگم ضلع اناؤ کے قصبہ موہان کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ریاستِ حیدرآباد کی ہائی کورٹ میں وکیل تھے۔ خاندانی علمی ماحول کی بدولت انھیں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی بھی عمدہ تعلیم حاصل ہوئی۔1901ء میں ان کی شادی مولانا حسرت موہانی سے ہوئی۔ ازدواجی زندگی کے آغاز کے بعد وہ صرف ایک مثالی رفیقۂ حیات ہی ثابت نہ ہوئیں بلکہ اپنے شوہر کی سیاسی اور قومی جدوجہد میں بھی بھرپور شریک رہیں۔1908 میں مولانا حسرت موہانی کی پہلی گرفتاری نے نشاط النساء بیگم کی عملی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد انھوں نے نہ صرف گھر کی ذمے داریاں سنبھالیں بلکہ وہ ہر قومی، سیاسی اور عوامی تحریک میں مولانا حسرت موہانی کی مضبوط معاون اور ہم سفر رہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے خود اس حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب انھیں پہلی مرتبہ قید کیا گیا تو نشاط النساء بیگم نے ایک خط میں ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے لکھا تھا:

> ''تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا، خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو، تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب کو انھوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا جن کے ہمراہ وہ جیل میں بھی مجھ سے ملنے آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتہ آیا کیں لیکن آخر تک ان کی جرأت، ہمت میں فرق نہ آیا۔''12

مولانا حسرت موہانی کی گرفتاری کے بعد بیگم حسرت موہانی نے نہ صرف ان کے مقدمات کی پیروی کی بلکہ علی گڑھ کے رسل گنج میں قائم سودیشی اسٹور کی ذمے داریاں بھی سنبھالیں۔ مالی تنگی کے باوجود انھوں نے کبھی کسی کی مدد قبول نہیں کی۔

انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں خواتین کی شمولیت کو تقویت دی اور ہر مشکل وقت میں حسرت موہانی کا بھرپور ساتھ نبھایا۔ آخر کار مسلسل قومی سرگرمیوں، مالی پریشانیوں اور مشکلات کے باعث ان کی صحت متاثر ہوئی اور 18 اپریل 1937ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

مذکورہ معروف انقلابی خواتین کے علاوہ بھی بے شمار ایسی بہادر اور عزم و حوصلے سے بھرپور مسلم خواتین تھیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے برطانوی حکومت کے ظلم و ستم کا سامنا کیا، پولیس کی لاٹھیاں برداشت کیں، جرمانے ادا کیے، قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور آزادی کے مقصد کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی رہیں۔ ان کا عزم اس وقت تک متزلزل نہیں ہوا جب تک ہندوستان کو برطانوی تسلط سے آزادی حاصل نہیں ہوگئی۔ ان کی بے لوث جدوجہد اور قربانیاں ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ احترام اور قدر و منزلت کے ساتھ یاد رکھی جائیں گی۔

حواشی:

1. خواتین ہند کے تاریخی کارنامے، فضل حق عظیم آبادی، بہار پبلکیشن نیا ٹولہ، پٹنہ، 1998، ص 146-147
2. ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، 1990، ص 47
3. خواتین ہند کے تاریخی کارنامے، فضل حق عظیم آبادی، بہار پبلکیشن نیا ٹولہ، پٹنہ، 1998، ص 160-161
4. ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، 1990، ص 115

❖❒❖❒

Sabi Ji
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

نکہت

تحریک آزادی کی اہم خواتین رہنما

ہندوستان کی جنگ آزادی میں صرف مرد مجاہدین نے قربانیاں نہیں دیں بلکہ خواتین نے بھی اپنی غیر معمولی جرأت، بہادری اور قربانی کا مظاہرہ کیا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر اپنی سیاسی اور معاشی گرفت مضبوط کر لی تو ملک کے مختلف علاقوں میں آزادی کی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ (1857) کی جنگ آزادی سے لے کر (1947) تک مردوں کے شانہ بشانہ خواتین نے بھی عملی حصہ لیا۔ ان میں رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، آبادی بانو بیگم عرف (بی اماں) عزیزن بائی، جھلکاری بائی، کستور با گاندی، سروجنی نائیڈو اور ارونا آصف علی، کے نام قابل ذکر ہیں۔

رانی لکشمی بائی (1828-1858) کا اصل نام منیکر نیکا (منو) تھا۔ ان کی شادی جھانسی کے راجہ گنگا دھر راؤ سے ہوئی۔ شادی کے بعد وہ رانی لکشمی بائی کے نام سے جانی گئیں۔ راجہ کی وفات کے بعد انگریزوں نے ان کے گود لیے بیٹے دامودر راؤ کو راجہ کا جانشین ماننے سے انکار کر دیا اور جابرانہ طور پر جھانسی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ رانی نے انگریزوں کے سامنے سر جھکانے کے بجائے مقابلے کا راستہ اختیار کیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ میں لڑتی رہیں۔ آخر کار (18 جون 1858) کو گوالیار کے قریب جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئیں۔ ان کی بہادری کو آج بھی آزادی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ رانی لکشمی بائی کی بہادری کا اعتراف خود برطانوی جنرل 'سر ہیوروز' نے بھی کیا۔ اس کے مطابق:

''سر ہیوروز کی فوج کے مقابلے میں رانی نے مضبوطی کے ساتھ اپنی فوج کو کھڑا کیا اور اپنی سوجھ بوجھ سے اس نے زبردست تیزی کے ساتھ سر ہیوروز کی فوج پر حملہ کیا۔ رانی کا دستہ کئی مقامات پر دشمن کی فوج کا شکار ہوا۔ رانی کے فوجیوں کی تعداد لگاتار کم ہوتی چلی گئی، پھر بھی رانی سب سے آگے دکھائی دیتی تھی۔ وہ بار بار اپنی بکھری ہوئی فوج کو جمع کرتی رہی اور قدم قدم پر غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیتی رہی۔'' (بحوالہ پنڈت سندر لال، ص، 83)

رانی لکشمی بائی کا نام شجاعت اور وطن پرستی کا استعارہ ہے، لیکن ان کی ذات میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں مختلف مذاہب اور مختلف ذاتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو وطن پرستی کے جذبے سے سرشار کیا بلکہ انگریز حکمرانوں کے ناپاک شکنجے سے ملک کو آزاد کرانے کی ترغیب دی۔ رانی لکشمی بائی کے ہمت و حوصلے نے یہ ثابت کر دیا کہ خواتین بھی ہر وہ کام بہ خوبی کر سکتی ہیں جو روایتی طور پر مردوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اسی وجہ سے رانی کی فوج میں بڑی تعداد میں خواتین موجود تھیں۔ رانی لکشمی بائی نے اپنے وقت کے مروجہ سماجی اقدار سے انحراف کرتے ہوئے ترقی پسند جدو

عمل میں ایقان رکھنے والی عورت کا تصور پیش کیا۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی استعماری پالیسیوں کے خلاف جن خواتین نے مخالفت کی ان میں جھلکاری بائی کا نام قابل ذکر ہے۔ جھلکاری بائی کی ولادت (22 نومبر 1830) کو جھانسی کے گاؤں اتر پردیش میں ہوئی۔ کوری برادری کا شمار سماجی اور معاشی طور پر کمزور طبقات میں ہوتا تھا۔ بچپن میں ماں کے انتقال کے بعد ان کی پرورش والد نے کی۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو گھریلو کاموں کے ساتھ گھڑسواری، تیر اندازی اور تلوار بازی کی تربیت بھی دی جو اس وقت کی خواتین کے لیے غیر معمولی بات تھی۔ جھلکاری بائی کی شادی پورن کوری سے ہوئی جو جھانسی کی فوج میں سپاہی تھے۔ شوہر کے ذریعے جھلکاری بائی کی ملاقات رانی لکشمی بائی سے ہوئی۔ رانی ان کی مہارت اور ذہانت سے بے حد متاثر ہوئی اور انھیں خواتین کی فوج ''درگا دل'' میں شامل کرلیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ اس دستے کی اہم رکن بن گئیں۔

محاصرے کے دوران میں جب صورت حال نہایت نازک ہو گئی تو جھلکاری بائی نے انگریزوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ اس حکمت عملی سے رانی کو قلعے سے نکل کر اپنی فوج کو دوبارہ منظّم کرنے کا موقع ملا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جھلکاری بائی نے جھانسی کے دفاع میں غیر معمولی جرأت اور وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ جھلکاری بائی کا شمار ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والی ان خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر وطن کی آزادی میں حصہ لیا۔ ان کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے وطن سے محبت کا جذبہ کسی خاص طبقے یا جنس کی میراث نہیں ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو کسی بھی انسان کو عظیم بنا سکتے ہیں۔

کستوربا گاندھی (1869 - 1944) کو ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ انھیں عموماً مہاتما گاندھی کی بیوی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود ایک باہمت با اصول اور فعال مجاہدِ آزادی تھیں۔ انھوں نے نہ صرف گاندھی جی کے سیاسی نظریات کی تائید کی بلکہ تحریک عدم تعاون، سول نافرمانی اور بھارت چھوڑو تحریک میں عملی حصہ لیا اور کئی مرتبہ جیل بھی گئیں۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے قیام کے دوران میں ان کے ہمراہ رہیں۔ (1897) میں کستوربا گاندھی نے جنوبی افریقہ پہنچ کر ہندوستانی تارکین وطن کے حقوق کے لیے چلنے والی تحریک میں حصہ لیا اور نسلی امتیاز کے خلاف ستیہ گرہ شروع کیا۔ (1913) میں انھیں پہلی بار گرفتار کیا گیا۔ انھوں نے جیل کی تکالیف برداشت کیں لیکن اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹیں۔ کستوربا گاندھی نے (1915) میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپس آنے کے بعد آزادی کی تحریک میں بھرپور تعاون کیا۔ وہ گاندھی جی کے ساتھ مختلف علاقوں کے دورے کرتیں، عوام کو بیدار کرتی اور خواتین کو ملک کی آزادی میں شامل ہونے پر آمادہ کرتیں۔

(1920) کو عدم تعاون تحریک کے دوران میں کستوربا گاندھی نے غیر ملکی کپڑوں کے بائیکاٹ، کھادی کے فروغ اور قومی بیداری کے لیے اہم خدمات انجام دیں۔ (1930) میں نمک ستیہ گرہ اور سول نافرمانی تحریک کے چلتے مختلف شہروں میں ہونے والے جلسوں سے خطاب کیا اور برطانوی قوانین کے خلاف احتجاج میں حصہ لیا۔ (1942) میں 'بھارت چھوڑو تحریک' کے شروع میں گاندھی جی سمیت کانگریس کے تمام بڑے رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ کستوربا گاندھی کو بھی گرفتار کر کے آغا خان محل، پونے میں نظر بند رکھا گیا۔ قید کے دوران میں ان کی صحت مسلسل خراب ہوتی گئی لیکن انھوں نے رہائی کی درخواست نہیں کی اور اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

کستوربا گاندھی نے صرف سیاسی میدان میں ہی نہیں بلکہ سماجی اصلاحات میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ خواتین کی تعلیم، صفائی، دیہی ترقی، اچھوتوں کے حقوق اور خود انحصاری کی حامی تھیں۔ (22 فروری 1944) کو آغا خان محل میں نظر بندی کے دوران کستوربا گاندھی کا انتقال ہو گیا۔ وہ انتہائی سادہ، صابر، باہمت اور باکردار خاتون تھیں۔ انھوں نے کبھی شہرت کی خواہش نہیں کی اور خاموشی سے اپنا کام کرتی رہیں۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کستوربا گاندھی نے اپنی پوری زندگی ملک وقوم اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف

کر دی۔ان کی خدمات صرف گاندھی جی کی معاونت تک محدود نہ تھی بلکہ وہ خود ایک مؤثر سماجی مصلح، سیاسی کارکن اور مجاہدِ آزادی تھیں۔ ہندوستان کی آزادی کا کوئی باب خواتین کی قربانیوں سے خالی نہیں ہیں۔ وہ کبھی حوصلہ بن کر، کبھی طاقت بن کر، کبھی تحریک بن کر متحرک رہیں اور مجاہدین کا حوصلہ بلند کرتی رہیں۔

سروجنی نائیڈو (1879-1949) کا نام ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں نہایت احترام سے لیا جاتا ہے وہ ایک ممتاز شاعرہ، مدون، سیاست داں اور تحریک آزادی کی سرگرم کارکن تھیں۔ان کی دلکش شاعری اور ولولہ انگیز تقاریر کی وجہ سے انھیں 'بلبل ہند' کے لقب سے نوازا گیا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی، گوپال کرشن گوکھلے، پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر قومی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں فعال کردار ادا کیا۔ سروجنی نائیڈو بنیادی طور پر شاعرہ تھیں۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب ،فطرت، محبت، قومی شعور اور آزادی کا جذبہ نمایاں ہیں۔ انھوں نے گوپال کرشن گوکھلے کی ترغیب پر قومی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور مہاتما گاندھی کے ساتھ مل کر عدم تعاون ،سول نافرمانی اور نمک ستیہ گرہ جیسی تحریکوں میں بھرپور تعاون کیا۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا، جلسوں میں شرکت کی اور خواتین کو تحریک آزادی میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی۔

سروجنی نائیڈو (1925) میں انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی ہندوستانی خاتون صدر منتخب ہوئیں ۔اس سے پہلے (1917) میں اینی بیسنٹ صدر منتخب ہوئیں لیکن وہ ہندوستانی نہ تھیں۔ ان کا انتخاب اس بات کا ثبوت تھا کہ ہندوستان کی قومی تحریک میں خواتین کی قیادت کو تسلیم کیا جا رہا تھا۔ (1930) میں مہاتما گاندھی نے نمک ستیہ گرہ شروع کیا تو سروجنی نائیڈو اس تحریک میں ان کے ہمراہ رہیں۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد انھوں نے کئی مقامات پر تحریک کی قیادت کی اور برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج جاری رکھا۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین کی تعلیم ،سماجی ترقی اور سیاسی شرکت کی بھرپور حمایت کی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ جب تک خواتین قومی

> **'سروجنی نائیڈو (1879-1949) کا نام ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں نہایت احترام سے لیا جاتا ہے وہ ایک ممتاز شاعرہ، مدون، سیاست داں اور تحریک آزادی کی سرگرم کارکن تھیں۔ان کی دلکش شاعری اور ولولہ انگیز تقاریر کی وجہ سے انہیں 'بلبل ہند' کے لقب سے نوازا گیا'**

تحریک میں برابر کا کردار ادا نہیں کریں گی اس وقت تک ہمارا ملک آزاد نہیں ہوسکتا ہے۔تحریک آزادی کے دوران میں سروجنی نائیڈو کو متعدد بار گرفتار کیا گیا۔جیل کی سختیاں برداشت کی لیکن آزادی کے مشن سے دست بردار نہ ہوئیں۔سروجنی نائیڈو کی خدمات صرف تحریک آزادی تک محدود نہ تھی بلکہ انھوں نے خواتین کی تعلیم ،قومی یکجہتی اور جمہوری اقدار کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

(1942) میں 'ہندوستان چھوڑو تحریک' کی روحِ رواں کہی جانے والی ارونا آصف علی کی پیدائش (1909) میں ہریانہ کے خوشحال بنگالی برہمن خاندان میں ہوئی۔ بچپن ہی سے وہ ذہین ،خوددار اور غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں ۔انھوں نے ابتدائی تعلیم نینی تال کے ایک معروف کانوینٹ اسکول سے حاصل کی۔ ان کی شخصیت مختلف فکری اور سماجی عوامل کا نتیجہ تھی۔ آزادی پسند رہنماؤں کی تقاریر نے ان کے اندر قومی خدمات کا جذبہ پیدا کیا۔ ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات میں غیر معمولی جرأت ، بے خوفی، اصول پسندی ،ثابت قدمی، مذہبی رواداری، قومی یکجہتی ، خواتین کے مساوی حقوق کی حمایت تھی۔ انھوں نے (9 اگست 1942) کو ممبئی کے گوالیار ٹینک میدان میں ترنگا لہرایا۔ یہ ان کی زندگی کا ایسا تاریخی کارنامہ ہے جس نے پورے ملک میں آزادی کی تحریک کو نئی قوت عطا کی۔

آزادی کے بعد انھوں نے سماجی انصاف، جمہوری اقدار، مزدوروں کے حقوق ،خواتین کی ترقی اور صحافت کے میدان میں

نمایاں کارنامے انجام دیے۔ان کی پوری زندگی اس بات کی روشن مثال ہے کہ عزم حوصلہ اور قومی شعور رکھنے والی ایک خاتون بھی تاریخ کا رخ بدل سکتی ہے۔1857 کی جنگ آزادی ہندوستانیوں کی پہلی بغاوت تھی۔اس جنگ نے فوری طور پر تو آزادی نہیں دلائی لیکن قومی شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔بیسویں صدی میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں عدم تعاون تحریک،سول نافرمانی تحریک اور ہندوستان چھوڑو تحریک نے برطانوی حکومت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔اس تحریک میں ارونا آصف علی بھی شامل رہیں۔انھوں نے اپنی عملی جدوجہد سے ہندوستان کی تاریخ میں اہم مقام حاصل کیا۔

ان مذکورہ خوتین کے علاوہ بھی بہت سی خواتین نے جنگ آزادی کے لیے قربانیاں پیش کی ہیں۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی جنگ آزادی بر صغیر کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔یہ وہ تحریک تھی جس نے ہندوستانی عوام میں آزادی کا شعور پیدا کیا۔(1757) کی جنگ پلاسی سے لے کر(1947) تک مختلف مذاہب،قوم سے تعلق رکھنے والے مرد اور خواتین نے قومی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

Nighat
Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)
nighatkhanurdu@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................... بتاریخ...

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

تبسم آرا

قائدانہ پیکر کی مثال
بی اماں

آزادی، وہ بنیادی حق جس کو حاصل کرنے کی بڑی قیمت چکائی گئی ہے ۔ جان کی، مال کی اور آرام کی قربانی دے کر آزادی کے متوالوں نے اپنی آنے والی نسلوں کے لیے آزاد فضا میں سانس لینا آسان کیا ہے ۔ ہندوستان کی آزادی بھی کوئی حادثہ یا معجزہ نہیں بلکہ کئی سالوں کی جد و جہد اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔اس جنگ میں شامل ہونے والے تمام افراد خواہ وہ مرد ہوں یا عورت قابلِ احترام اور قابلِ رشک ہیں ۔ان کی قربانیاں نا قابلِ فراموش داستان ہے ۔

تحریک آزادی میں مردوں کے ساتھ خواتین نے بھی حصہ لیا اور اپنی بہادری اور ہمت سے نہ صرف یہ کہ مجاہدین کا حوصلہ بڑھایا بلکہ بذاتِ خود جنگوں میں شریک ہوئیں، تحریکوں میں حصہ لیا، خفیہ پیغامات پہنچائے ، مالی تعاون کیا، عوام کو بیدار کیا ، چندہ اکٹھا کرنے میں مدد کی ، جیل گئیں اور اس سے آگے بڑھ کر جامِ شہادت نوش کیا۔ 1857 میں شروع ہونے والی پہلی جنگِ آزادی سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ ساتھ رہیں اور اپنی کارفرمائیوں سے طلوعِ صبحِ آزادی کی راہیں ہموار کرتی رہیں ۔ چاہے وہ بیگم زینت محل ہو ، بیگم حضرت محل ، سلطان زمانی بیگم ، رانی لکشمی بائی ، جھلکاری بائی ، ساوتری بائی پھلے ، درگا بائی ، رانی چمپا ، رانی ویلو نا چیار ، عزیزن بائی ، وجیہ لکشمی پنڈت ، صغرا خاتون ، کلپنا دتہ ، کملا نہرو ، بی بی عبد السلام ، بیگم انیس قدوئی ، بیگم نشاط النسا موہانی، ارونا آصف علی، سروجنی نائیڈو، اینی بیسنٹ ، ڈاکٹر لکشمی سہگل ، بی اماں وغیرہ نے آزادی کی مشعل کو دلوں میں جلائے رکھا۔ یہ تو چند مثالیں ہیں ان کے علاوہ ہزاروں ایسی خواتین ہیں جنھوں نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر ملک کو آزادی دلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہزاروں خواتین ایسی بھی ہیں جن کا نام تاریخ میں درج نہیں ہے لیکن جنھوں نے اپنی زندگی ملک کی آزادی کے نام کر دی تھی ۔

بی اماں بھی تحریک آزادی میں حصہ لینے والی ایسی خاتون ہیں جنھوں نے اپنی بہادری ، اولوالعزمی ، جرأت اور ہمت سے انگریزی حکومت کے حوصلوں کو پست کرنے میں مدد کی ۔علی برادران سے کون واقف نہیں ہے ۔علی برادران یعنی مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی ، ہندوستان کی جنگ آزادی میں پیش پیش رہنے والے ایسے کردار ہیں جن کے ذکر کے بغیر تحریک آزادی کی کہانی ادھوری رہ جاتی ہے ۔محمد علی جوہر ایک ایسا نام جن کی کوششوں اور کارگزاریوں کی بدولت ہندوستان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسی مقبول و معروف یونیورسٹی کا قیام ہوا جس سے تعلیم حاصل کے لاکھوں بچوں نے اپنی زندگی سنواری ہے ۔ ایسے شعلوں کی پرورش و پرداخت کرنے والی کوئی عام عورت نہیں ہوسکتی۔ آبادی بانو بیگم عرف بی اماں بھی کوئی

عام عورت نہیں تھیں۔انھوں نے اپنی قیادت،تحریراورتقریر کے ذریعے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو مضبوط کیا۔ان کا قومی سیاست میں حصہ لینا ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔یتیم بچوں کی پرورش کرنا، ان کی دینی،سماجی اور سیاسی تعلیم کا خیال رکھنا اور پورے خاندان اور سماج کے خلاف جا کر اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانا ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔اس زمانے میں جب مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے روکا جاتا تھا،ایک اکیلی عورت کا سماج کے خلاف جانا کسی غیر جرأت مند شخصیت کے بس کی بات نہیں تھی۔ان کی تمام صفات پر پوری داستان لکھی جا سکتی ہے۔ڈاکٹر بانو سرتاج اپنی کتاب 'ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین' میں بی اماں کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ہندوستان کی سیاسی افق پر نمودار ہونے والی اول مسلم پردہ نشین خاتون بی اماں ہیں۔وہ اول ہندوستانی خاتون ہیں جن کی صدارت میں آل انڈیا خواتین کانگریس ہندوستان کی آزادی پر بحث کرنے کے لیے طلب کی گئی۔
>
> (ص۔50)

آبادی بانو کی پیدائش سنہ 1852 میں امروہہ ضلع مرادآباد میں ہوئی تھی۔ان کی پیدائش کا اندازہ خود محمد علی نے لگایا تھا۔ان کے مطابق ان کی امی کہا کرتی تھیں کہ غدر کے وقت وہ پانچ یا چھ سال کی تھیں اس لحاظ سے انھوں نے ان کی پیدائش کا سال 1852 مانا ہے۔اس کا ذکرانھوں نے اپنے اخبار 'کامریڈ'(21 نومبر 1924) میں لکھے گئے اپنے مضمون میں کیا ہے۔بی اماں کی شادی رام پور سے تعلق رکھنے والے ایک زمیندار عبدالعلی سے ہوئی تھی۔وہ رام پور کے شیخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔رام پور میں ان کی کافی زمین جائداد تھی۔ان کو ریاست سے مالی تعاون بھی ملتا تھا۔33 سال کی عمر میں ان کو کالرا جیسی بیماری نے آگھیرا۔اسی بیماری کے سبب وہ کم عمری میں ہی دنیا کو الوداع کہہ گئے۔آبادی بانو 28 سال کی جواں عمری میں بیوہ ہوگئیں۔اس وقت ان کے چھ بچے تھے۔پانچ لڑکے اور ایک لڑکی۔ان سب میں محمد علی سب سے چھوٹے تھے۔وہ محض دوسال کے تھے۔ان سب کی ذمے داری بی اماں کے اوپر آگئی۔انھوں نے بچوں کی پرورش میں کوئی کمی نہیں رکھی۔بچوں کبھی والد کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔وہ خود سادہ لباس اور سادہ کھانے پر گزارا کرتیں لیکن بچوں کو اچھا کھانا،اچھا لباس اور اچھی تعلیم دینے کا انتظام کرتی رہیں۔انھوں نے ان کی تربیت بھی بڑے سلیقے سے کی۔انگریزی اسکول میں پڑھنے اور ولایت کا دورہ کرنے کے باوجود ان کے بچے اسلام اور دین سے الگ نہیں ہوئے۔آبادی بانو نے اپنے بچوں کو ملک و ملت سے محبت کرنے کا ہنر خوب سکھایا تھا۔انگریزوں کی مخالفت کرنا ان کی تربیت میں شامل تھا۔

> **''آبادی بانو کی پیدائش سنہ 1852 میں امروهه ضلع مرادآباد میں هوئی تهی۔ ان کی پیدائش کا اندازہ خود محمد علی نے لگایا تها۔ان کے مطابق ان کی امی کها کرتی تهیں که غدر کے وقت وہ پانچ یا چھ سال کی تهیں اس لحاظ سے انهوں‌نے ان کی پیدائش کا سال1852 مانا هے ۔ اس کا ذکرانهوں نے اپنے اخبار 'کامریڈ'(21 نومبر 1924) میں‌لکهے گئے اپنے مضمون میں کیا هے ۔**

بی اماں کی سیاسی زندگی کا آغاز ان کے بیٹوں کی گرفتاری کے بعد ہوتا ہے لیکن آزادی کی جدوجہد اور اس سبب درپیش آنے والے مسائل سے وہ بچپن سے دوچار ہوئی تھیں۔پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہی انگریزوں نے عوام کا جینا دشوار کر دیا تھا۔اس دشواری کا سامنا بی اماں کے خاندان کو بھی کرنا پڑا تھا۔ان کے چچا کو انگریزوں نے مرادآباد میں پھانسی کی سزا سنائی۔ان کے دوسرے چچا فرار ہوگئے اور پھر واپس نہیں آئے۔ان کے والد کو زندگی بھر نام بدل کر اپنی پہچان چھپانی پڑی اور گمنامی کی زندگی گزارنی پڑی۔ان کے بیٹوں کی

گرفتاری کے بعد وہ مکمل طور پر قومی سیاست کا حصہ بن گئیں۔

پیرانہ سالی کے باوجود وہ مختلف اجلاس میں شرکت کیا کرتی تھیں اور لوگوں کو اتحاد اور بھائی چارے کا درس دیا کرتی تھیں۔ 1922 میں انھوں نے شملہ کی امیر ترین خواتین کو غیر ملکی کپڑوں کو چھوڑ کر سودیسی یعنی کھادی کپڑے استعمال کرنے پر آمادہ کر لیا۔24 اگست 1922 کو انبالہ میں جلیانوالہ باغ کے کئی اجلاس میں شامل ہوئی تھیں۔30 دسمبر 1921 کو احمد آباد میں خواتین کی کل ہند زنانہ کانفرنس کی صدارت بی اماں نے کی تھی۔وہ ہوم رول لیگ میں اپنے پورے خاندان کے ساتھ شامل ہوئی تھیں۔تلک فنڈ اور سمرنا فنڈ کے لیے انھوں نے اچھی خاصی رقم جمع کی تھی۔اس کے علاوہ وہ ہوم لیگ اور اینی بیسنٹ فنڈ کے لیے ماہوار دس روپیہ چندہ بھیجا کرتی تھیں۔اس فنڈ سے برطانوی حکومت کے ذریعے گرفتار ہوئے افراد کے گھر والوں کی مالی مدد کی جاتی تھی۔اس کا ذکر انھوں نے 4 اگست 1917 کو سبرامنی آئر کو بھیجے گئے خط میں کیا ہے۔اسی خط میں انھوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان کا دل ان نوجوانوں کے گھر والوں کے لیے کتنا دکھتا تھا جن کو بلا وجہ انگریزی حکومت نے قید یا نظر بند کر رکھا تھا۔وہ ان کے خاندان کے لوگوں کے لیے کافی فکر مند تھیں اور انھوں نے ملک کے تمام نظر بند لوگوں کے حالات کا ریکارڈ رکھنے اور ان کی مدد کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ بی اماں کا خواب تھا کہ وہ لال قلعے سے فرنگی جھنڈا اترتے دیکھیں۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ انھوں نے لال قلعے سے ہندوستانی جھنڈا اترتے دیکھا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ ودیسی جھنڈا اترتے دیکھیں۔ یعنی ہندوستان کو آزاد دیکھنا ان کا مقصد تھا۔اس کے لیے ان سے جو ممکن ہو سکا انھوں نے کیا۔

”بی اماں کے دو اہم کام قابل ستائش ہیں ۔ایک ہندو مسلم اتحاد کو بڑھاوا دینے کی کوشش کرنا دوسری خلافت آندولن اور سودیشی آندولن میں شامل ہونے کے لیے مسلمانوں کو آواز لگانا ۔بعض دفعہ خلافت اندولن پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کے لیے نہیں تھا، ترکوں کے لیے تھا۔ جبکہ اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ خلافت آندولن برطانوی حکومت کے خلاف تھا اس لیے آندولن ہندوستان کے لیے مفید تھا۔ اس بات کو مہاتما گاندھی اور بعض دوسرے دور اندیش لیڈروں نے سمجھ لیا تھا اسی لیے انھوں‌نے اس میں‌بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔اس کے بعد برطانوی حکومت نے ہندو مسلم یکجہتی کے وہ کارنامے دیکھے جس سے ان کو یقین ہو چلا کہ ان لوگوں کے متحد ہوتے ہوئے ان کا راج کرنا آسان نہیں۔“

30 دسمبر 1917 کو کلکتہ میں ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں انھوں نے شرکت کی تھی۔وہاں وہ مسلمانوں کے نام ایک پیغام لے کر آئی تھیں جس کو قاضی عبد الغفار نے پڑھ کر سنایا۔ان کا پیغام اتنا پر جوش اور نشتر آمیز تھا کہ وہاں موجود لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔ وہاں سے انھوں نے مسلمانوں کو ملک و ملت کے نام پر ایک ہونے کا پیغام دیا تھا۔اسی اجلاس میں انھوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا تھا کہ اگر ان کے بیٹوں نے ملک یا قوم سے غداری کے بدلے اپنی آزادی لینی چاہی تو وہ ان کو اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیں گی ۔ عابدہ سمیع الدین نے اپنی کتاب ’ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ‘ میں ان کے پیغام کو شامل کیا ہے:۔

> میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر آزادی حاصل کرنے کی کوئی ایسی شرط قبول کریں گے جو اسلام کی شان کے خلاف ہو اور مفاد ملک کے منافی ہوگی تو باوجود اپنی اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے اس سے قبل کہ وہ صراطِ مستقیم سے پلٹ سکیں میں ان شاء اللہ اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی۔(ص۔90۔91)

بی اماں کے دو اہم کام قابل ستائش ہیں۔ایک ہندو مسلم اتحاد کو بڑھاوا دینے کی کوشش کرنا دوسری خلافت آندولن اور سودیسی آندولن میں شامل ہونے کے لیے مسلمانوں کو آواز لگانا۔بعض دفعہ خلافت آندولن پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کے لیے نہیں تھا، ترکوں کے لیے تھا۔ جبکہ اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ خلافت آندولن برطانوی حکومت کے خلاف تھا اس لیے آندولن ہندوستان کے لیے مفید تھا۔ اس بات کو مہاتما گاندھی اور بعض دوسرے دور اندیش لیڈروں نے سمجھ لیا تھا اسی لیے انھوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اس کے بعد برطانوی حکومت نے ہندو مسلم یکجہتی کے وہ کارنامے دیکھے جس سے ان کو یقین ہو چلا کہ ان لوگوں کے متحد ہوتے ہوئے ان کا راج کرنا آسان نہیں۔

شفق سوپوری نے 'صدائے خاتون' کے نام سے ایک نظم لکھی تھی۔جس میں انھوں نے بی اماں اور ان کے بیٹوں کو دیے گئے ان کی تعلیم کا ذکر کیا تھا۔ایک وقت ایسا تھا جب ہندوستان کے مختلف کونوں میں اسی نظم کی باتیں ہوا کرتی تھی۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
گر ذرا سست دیکھوں گی تم کو
دودھ ہرگز نہ بخشوں گی تم کو
میں دلاور نہ سمجھوں گی تم کو
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ پڑھ خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحان میں اترنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

معاون کتب:

1 ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین، ڈاکٹر بانو سرتاج، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2012

2 ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ 1990

3 جنگ آزادی کی بہادر عورتیں، شنانہ، جلانی پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1997

4 علی برادران اور ان کا زمانہ، سید محمد ہادی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1978

5 افادات محمد علی، رئیس احمد جعفری، اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد، 1945

❒❖❒

Tabassum Ara
Village -Rudalpur
Post- Jalalpur bazar
District Saran
Chapra-841412 (Bihar)
Mob: 9931455856

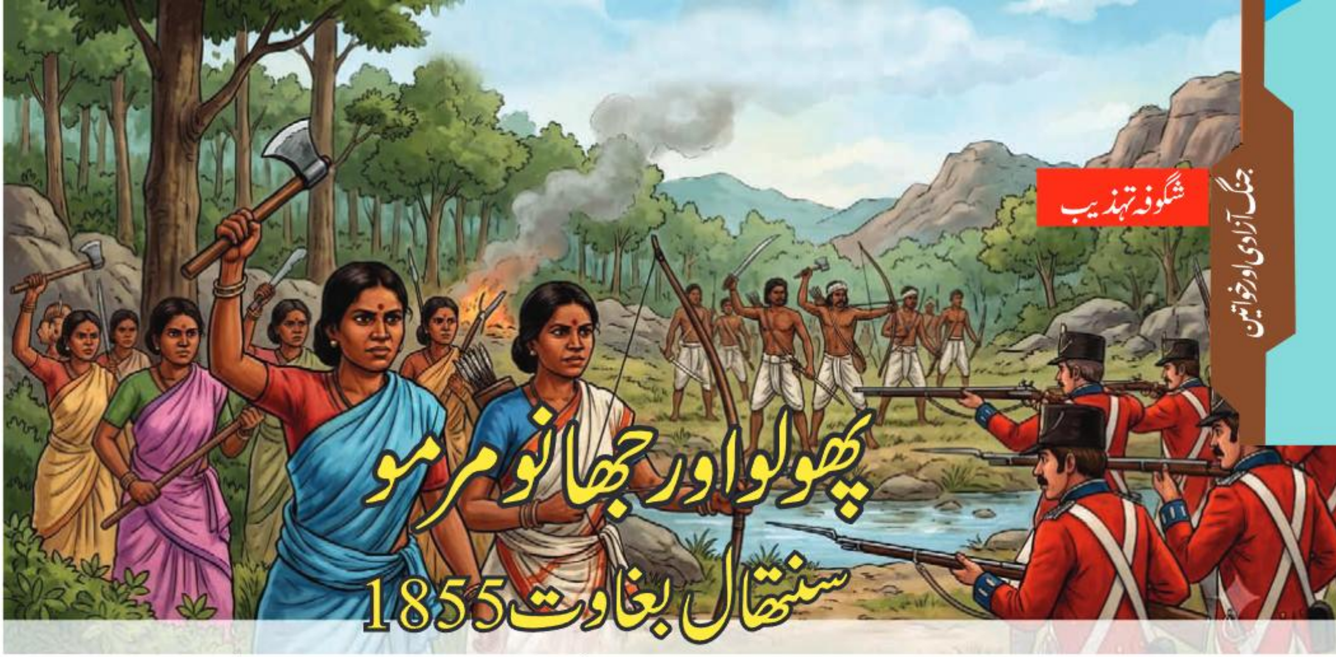

پھولو اور جھانو مرمو
سنتھال بغاوت 1855

شگوفہ تہذیب

انسانی تہذیب کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہی زندگی کے مساوی اور ناگزیر ستون رہے ہیں۔ خالق کائنات نے دونوں کو یکساں عزت، وقار اور اہمیت عطا کی ہے اور اپنے نظام حیات کی تکمیل کے لیے ہر دور میں ان دونوں سے مختلف ذمے داریاں انجام دلوائی ہیں۔ خواہ حضرت آدم اور حضرت حوا کے زمین پر آنے کا واقعہ ہو یا رام اور سیتا کے بن باس کی داستان، ہر عہد میں مرد وزن ایک دوسرے کے رفیق سفر اور معاون کے طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں دونوں نے باہم مل کر انسانی معاشرے کی تعمیر، تہذیب کی آبیاری اور تمدن کی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جس قدر اہمیت مرد کے حصے میں آتی ہے اسی قدر عورت بھی کاروان حیات کی ایک موثر، فعال اور ناگزیر تحریک سفر رہی ہے۔

یقیناً ہندوستان کی جنگ آزادی روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات و حادثات کا ایک اہم حصہ ہے جسے کسی طور فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

جب سونے کی چڑیا کہے جانے والے ہندوستان پر انگریز شکاریوں نے قبضہ کیا اور یہاں کے باشندوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر انگریزی قوانین کی بندشوں میں قید کرنے لگے تو بے شمار جاں بازوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے احتجاج کی آوازیں بلند کیں اور انقلابی جوش و جذبے کے ساتھ انگریزوں کے خلاف مورچہ کھول دیا۔

انگریزوں نے بھی ظلم و بربریت کی انتہا پار کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو بری طرح اپنے تشدد کا نشانہ بنایا۔ جب پانی سر سے اوپر چلا گیا تو پورے ہندوستان میں آزادی کی لہر دوڑ گئی ہندوستان کے ہر خطے سے صدائیں بلند ہونے لگیں اور ہر طبقے کے لوگ اپنی اپنی جان و مال کی قربانیاں پیش کرنے کے لیے جنگ آزادی کی آگ میں کود پڑے۔ کیا مرد، کیا عورت، کیا امیر، کیا غریب، بوڑھے، بچے، نوجوان غرض کہ ہر طبقہ پورے جوش وخروش کے ساتھ آگے آیا اور ان سب کا مقصد صرف ایک تھا مادرِ وطن کو آزاد کرانا۔ بہادر شاہ ظفر، چندر شیکھر آزاد، لالہ لاجپت رائے، بھگت سنگھ، منگل پانڈے، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا فضل حق خیرآبادی، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل اور نہ جانے ایسے کتنے ہی لوگوں نے برطانوی حکومت کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ انہی ناموں میں ایک نام مشرقی ہندوستان کی ریاست چھوٹا ناگپور (جھارکھنڈ) کے علاقے سنتھال پرگنہ جو کہ ریاست کے شمال مشرق میں واقع ہے وہاں کے رہنے والے دو بھائیوں سدھو اور کانہو کا بھی آتا ہے۔ دور حاضر کے صاحب گنج کے بھوگنا ڈیہہ کے رہنے والے ان دونوں بھائیوں نے اپنے جنون اور جذبے سے پورے علاقے کے لوگوں کو ایک جٹ کیا اور انگریزی حکومت

زمینداروں اور ساہوکاروں کے خلاف لڑائی لڑی ،اس لڑائی میں ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے انھی کی دو جڑواں بہنیں پھولو مرمو اور جھانو مرمو بھی آگے آئیں اور آزادی کی لڑائی میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

پھولو اور جھانو مرمو جھارکھنڈ کے تاریخ کی بہادر، دلیر، نڈر اور ناقابل فراموش بیٹیاں ہیں جنھوں نے 1855 کی مشہور جنگ آزادی ''سنتھال ہول وِدروہ'' میں انگریزی حکومت کے خلاف بڑا اہم کردار نبھایا تھا اور اپنے بھائیوں سدھو اور کانہو کے ساتھ مل کر بڑی بہادری سے انگریزوں کا سامنا کیا تھا۔

پھولو مرمو اور جھانو مرمو کی پیدائش سنہ 1832 کے آس پاس حالیہ صوبہ جھارکھنڈ کے ضلع صاحب گنج کے بھوگنا ڈیہہ گاؤں میں ہوئی۔ یہ سنتھال قبائلی طبقے کے مرمو قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔

1855 میں جب ہندوستان کے اکثر علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ تھا، برطانوی حکومتیں بھولے بھالے ہندوستانیوں پر جبر وتشدد کی ساری حدیں پار کر رہی تھیں، ظالم انگریزوں نے آدیواسیوں اور قبائلی لوگوں کے سبھی ذرائع اور وسیلوں پر قبضہ کر لیا تھا تو آدیواسیوں نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے انگریزوں کی مخالفت شروع کی اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اسی بغاوت اور احتجاج کے نتیجے میں ہول کرانتی کا آغاز ہوا۔ حالانکہ جھارکھنڈ میں طویل عرصے تک پورے طریقے سے انگریزوں کا قبضہ نہیں ہو پایا تھا کیونکہ جھارکھنڈ کے علاقوں میں لگاتار چھوٹی موٹی بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان بغاوتوں اور احتجاجوں کے خاتمے کے لیے برطانوی حکومتیں وقتاً فوقتاً زمینداروں اور ساہوکاروں کا سہارا لیا کرتی تھیں، باوجود اس کے بغاوتوں کا سلسلہ جاری تھا، ان بغاوتوں اور تحریکوں سے یہ فائدہ ہوا کہ لوگوں میں انگریزوں کے خلاف غصہ اور بدلے کی آگ بھڑکتی گئی اور انگریزوں کی غلامی چھوڑنے کا اور خود کو آزاد کرانے کا حوصلہ ملا۔ نتیجتاً آدیواسیوں نے اپنے جنگلات اور زمینوں کو بچانے کے لیے ایک بہت بڑی بغاوت اور احتجاج کا اعلان کیا۔ سنہ 1857 کی یادگار جنگ آزادی سے دو سال قبل 1855 میں آدیواسیوں نے اپنا وجود، اپنی زمین اور اپنا علاقہ بچانے کے لیے انگریزوں سے انقلابی جنگ کا اعلان کیا اور یہ بگل پھونکنے والوں میں انھی چاروں بھائی بہنوں سدھو، کانہو، پھولو اور جھانو کا نمایاں کردار رہا۔ خاص طور سے پھولو اور جھانو نے اس جنگ میں اہم رول نبھایا اور اس جنگ کی قیادت کر رہے اپنے دونوں بھائیوں سدھو اور کانہو کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑی رہیں اور انگریزوں سے لوہا لیا۔ انھوں نے جل، جنگل اور زمین کی حفاظت کے لیے ہزاروں آدیواسی عورتوں کو اکٹھا کیا اور جنگ میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کیا۔ آدیواسی عورتیں انھی دونوں بہنوں کی محنت اور لگن کی بدولت ہاتھوں میں ہتھیار اٹھائے، صف بستہ ہو کر آگے بڑھیں اور انگریزوں، سود خوروں اور زمینداروں کے خلاف مورچہ سنبھالا اور مردوں کے شانہ بشانہ انگریزوں سے ٹکرائیں۔

پھولو اور جھانو نے انگریزوں کے خلاف ایک خاص جنگی تکنیک یعنی گوریلا یُدھ کا استعمال کیا جس کے تحت یہ دونوں بہنیں جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر برطانوی فوجیوں پر تیر کمان سے حملے کرتیں یا بڑے متحرک طریقے سے کیے گئے اچانک حملے میں برطانوی فوجیوں کو مار گراتیں (جنگ میں گوریلا حکمت عملی کے تحت مقامی جغرافیے کا استعمال کرتے ہوئے چھپ کر حملے کرنا، اچانک وار کرنا اور مارو اور بھاگ جاؤ کا اصول اپنایا جاتا ہے تاکہ دشمن فوجوں کو مسلسل تھکایا جا سکے اور انہیں زیر کیا جا سکے۔)

پھولو اور جھانو نے عورتوں کو زمینداروں، ساہوکاروں اور برطانوی حکومت کے ظلم وتشدد کے خلاف بیدار اور ہوشیار کرایا، انھیں روایتی ہتھیاروں جیسے تیر، دھنش، بھالا اور تلواروں کے استعمال کی مشق کرائی اور ان کا حوصلہ بڑھایا تاکہ وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ میدان جنگ میں اپنی حصہ داری ثابت کریں اور خود ان دونوں بہنوں نے اس خواتین دستے کی قیادت اور رہنمائی کی، یہ دونوں اپنے ہاتھوں میں تلوار اور کلہاڑی لے کر دستے کی سربراہی کرتیں، ان کی اسی لگن اور حوصلے کا نتیجہ تھا کہ بھوگنا ڈیہہ میں مہاجنوں اور سود خوروں کے ظلم کے خلاف شروع ہوا احتجاج دیکھتے ہی دیکھتے پورے سنتھال پرگنہ میں پھیل گیا اور ایک بڑی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔

پھولو اور جھانو نے اس بغاوت میں اور بھی کئی اہم کارنامے انجام دیے ۔مثلاً اپنے بھائیوں سدھو اور کانہو کے پیغام دوسرے متحرک افراد تک پہنچاتیں اور یہ ساہو کاروں اور زمینداروں کی حرکتوں پر نظر رکھتیں۔ یہ دونوں بہنیں ہاتھوں میں کلہاڑی ،تیر،اور دھنش لے کر چلتیں ،انگریز فوج کی ٹکڑیوں پر نظر رکھتیں تا کہ باغیوں کے دستے کو آگاہ کر سکیں اور انگریز افواج کی ساری کارکردگی کا جائزہ اور ان سے حاصل ہونے والی ساری خبریں باغی لشکروں تک پہنچاتیں۔ یہ دشمنوں کی جاسوسی کر کے اہم معلومات اکٹھا کرتیں ،دور دراز کے علاقے میں پھنسے اپنے لوگوں تک رسد پہنچانے کا کام کرتیں اور مجاہدین کو ہتھیار پہنچانے کی ذمے داری بھی انہی کی ہوتی ۔غرض ان دونوں بہنوں کی مدد کے بغیر یہ بغاوت اور احتجاج ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا تھا ،انہی دونوں کی محنت اور کارکردگی کے ذریعے باغی گروہوں کو مضبوطی ملی اور وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو پائے۔ان دونوں نے ہی اپنے پیغامات کے ذریعے لوگوں کو اس احتجاج سے جوڑا اور دشمنوں کے ظلم و جبر کے خلاف بیدار کرایا، انھوں نے آدیواسی مردوں اور عورتوں میں دشمنوں کے خلاف وہ آگ بھری جو دشمنوں کے خیمے کو جلا کر راکھ کرنے کے لیے کافی تھی ، ان دونوں نے خواتین دستے کی سربراہی کی ،لوگوں کو اپنے ہتھیاروں کا استعمال سکھایا اور خود بھی ہر وقت ہاتھوں میں ہتھیار لے کر کمر بستہ رہیں اور جان کی پرواہ کیے بغیر ہر وقت قربانی دینے کے لیے تیار صف اول میں کھڑی نظر آئیں۔

یوں تو جنگ آزادی میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والوں یا شہید کر دیے جانے والے مردوں اور عورتوں کی بڑی لمبی فہرست ہے اور ان میں مشہور کچھ چند شہدا کو پوری دنیا جانتی ہے لیکن آج بھی بہت سے نام ایسے ہیں جو وقت کی دھول میں کہیں نہ کہیں گمنامی یا یوں کہیں کہ بہت مختصر تعارف کے ساتھ جانے جاتے ہیں۔خاص طور سے خواتین مجاہدین آزادی میں چند ایک نام کے علاوہ بہت طویل فہرست آپ فراہم نہیں کر سکتے ۔حالانکہ ایسا نہیں کہ عورتوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں نہیں پیش کیں ۔بلاشبہ عورتوں نے بھی بالکل مردوں کے شانہ بشانہ اپنی موجودگی درج کرائی اور ہمت اور بہادری کی مثالیں پیش کیں اور اپنی شہادت کا نذرانہ اپنے مادر وطن کو پیش کیا۔

سنہ 1854-1855 کی ہول کرانتی میں پھولو اور جھانو کا ناقابل فراموش کردار ہو یا1857 کی جنگ آزادی میں بہار کے سہسرام کی حاجی بیگم کی قیادت،1858 میں رانی لکشمی بائی کا میدان جنگ میں انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو جانا ہو یا بیگم حضرت محل کا انگریزوں کے خلاف بغاوت کی قیادت کے عوض انھیں جلا وطن کر دیا جانا ،عابدہ بیگم کا تحریک خلافت کے دوران خواتین کو بیدار کرنا ہو یا کنکلتا بروا کا1942 میں بھارت چھوڑو تحریک میں پولیس کی گولی کا نشانہ بن کر شہید ہو جانا (سول نافرمانی تحریک ،نمک ستیا گرہ)،تارا رانی سریواستو(1942 ء بھارت چھوڑو تحریک ،امبا بائی (تحریک عدم تعاون اور سول نافرمانی تحریک) ، برج کماری دیوی(بھارت چھوڑو تحریک)،سرسوتی دیوی (بھارت چھوڑو تحریک میں نمایاں کردار)، سادھنا دیوی(بھارت چھوڑو تحریک)، پریما دیوی(بھارت چھوڑو تحریک میں نمایاں کردار)،ننی بالا گوہا (سنہ 1930 عیسوی میں جھارکھنڈ میں نمک ستیا گرہ، سول نافرمانی تحریک میں اہم کردار)،سوشیلا سامد(گاندھی جی کی ڈانڈی مارچ میں قبائلی خواتین کی قیادت)۔

یہ چند ایسے نام ہیں جسے کسی طور فراموش نہیں کیا جا سکتا اور ان کے علاوہ نہ جانے کتنی ہی عورتوں نے اپنی زندگیوں کی قربانیاں پیش کیں۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ان کی قربانیوں کے عوض ملنے والی آزادی میں کم از کم ہم ان کے ناموں کو زندہ رکھ سکیں تا کہ انھیں خراج عقیدت پیش کیا جا سکے۔

❐❖❐

Shagufa Tahzib
Dhipa Toli, Post Office-Pundag
Police Station-Jagan Nathpur
Dist.Ranchi-834004 (Jharkhand)
Mob:- 9065737090

روشنی خان

صالحہ عابد حسین

'سلسلۂ روز وشب' کے جھروکے سے

اردو ادب کو جن خواتین نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ثروت مند بنایا ان میں صالحہ عابد حسین کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا تعلق حالی کے خانوادے سے تھا۔ صالحہ عابد حسین نے بیسویں صدی کے نصف اول میں 18 اگست 1913 کو پانی پت، پنجاب، کے ایک علمی و مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی لیکن اس گھر کا مذہبی ماحول اہل خانہ کی سماجی ترقی میں کبھی رکاوٹ نہیں بنا خواہ وہ مرد ہوں یا کہ عورت، اس علمی و ادبی خانوادے میں تعلیم اور تربیت کے معاملے میں صنفی امتیاز کو برتنے کا رواج نہیں تھا۔ جس زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم کو زندگی کے معاملات میں ثانوی حیثیت حاصل تھی اس زمانے میں ان کے خاندان کی لڑکیاں نہ صرف حصول تعلیم میں سرگرم تھیں بلکہ دیگر ثقافتی امور میں بھی بڑے انہماک سے حصہ لیتی تھیں اور اپنی خانگی اور سماجی زندگی میں مردوں کے شانہ بہ شانہ ہر مرحلے پر نمایاں رہیں۔

صالحہ عابد حسین کا اصلی نام مصداق فاطمہ اور قلمی نام صالحہ تھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین سے شادی کے بعد ادبی دنیا میں صالحہ عابد حسین کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ڈاکٹر عابد حسین کی شریک حیات بننے کے بعد انھوں نے ادب کے ساتھ ساتھ تعلیم کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے بھی خاطر خواہ واقفیت حاصل کی۔

صالحہ عابد حسین نے پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ انھوں نے افسانہ، ناول، ڈرامہ کے علاوہ بعض تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کی تحریریں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اس ضمن میں خصوصی طور پر یادگار حالی اور میر انیس کے فن پر ان کی کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے عذرا، آتشِ خاموش، راہِ عمل، قطرہ سے گُہر ہونے تک، یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب، اُلجھی ڈور، گوری سوئے سیج پر، اور 'ساتواں آنگن' ناول تحریر کیے ہیں۔ نراس میں آس، درد و درماں، تین چہرے تین آوازیں، سازِ ہستی اور ٹوٹنگے ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ کہانیوں اور ڈراموں کا مجموعہ 'نقشِ اول' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ 'سلک گوہر' کے عنوان سے ان کے مذہبی مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے اپنی غیر افسانوی تحریروں میں بھی خاصا رنگ بھرا ہے۔ ''ذکر جمیل'' کے نام سے اپنے بھائی خواجہ غلام السیدین کی سوانح کا دوسرا حصہ لکھا۔ ''جانے والوں کی یاد آتی ہے'' کے نام سے مختلف شخصیتوں کے خاکے تحریر کیے۔ 'سفر زندگی کے لیے سوز و ساز' کے نام سے سفر نامہ منظر عام پر آیا تو وہیں ''سلسلۂ روز و شب'' کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح قلم بند کی۔ صالحہ عابد حسین کی سوانحی تصانیف' سفر نامے اور دیگر تحریریں اردو کے غیر افسانوی ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں

اورانھیں ایک صاحب طرز ادیبہ کے طور پر پیش کرتی ہیں۔

اردو خود نوشت نگاری کی روایت میں خواتین کی جن خود نوشتوں کو شہرت حاصل ہوئی ان میں سلسلۂ روز و شب کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔سلسلۂ روز و شب میں صالحہ عابد حسین نے اپنی رودادِ حیات بہت دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔اس خود نوشت میں صالحہ عابد حسین کی شخصیت مشرقی اقدار اور طرز تمدن کا ایسا نمونہ نظر آتی ہے جو محبت، اخلاص، ایثار و ہمدردی جیسی انسانی صفات سے مزین ہے۔صالحہ عابد حسین کی یہ خود نوشت بیشتر ان واقعات و معاملات پر مبنی ہے جن کا تعلق ان کی خانگی زندگی سے رہا ہے اور اس زندگی میں ان کے والدین کے گھر کے علاوہ ان کی ازدواجی زندگی کے شب و روز شامل ہیں۔لیکن چونکہ ان کا تعلق ملک کے ایک ممتاز علمی و ادبی گھرانے سے تھا اور وہ خود بھی ادب کے میدان میں ایک مدت تک سرگرم رہیں لہٰذا اس خود نوشت میں بعض واقعات ایسے بھی درج ہیں جن سے اس عہد کے اردو ادب کی سمت و رفتار کا پتہ چلتا ہے۔اس اعتبار سے سلسلۂ روز و شب کی اہمیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ یہ اردو کی ایک مشہور خاتون قلمکار کی جنبش قلم سے وجود میں آئی ہے بلکہ اس میں ادب سے وابستہ واقعات و شخصیات کا ذکر اس کی ادبی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔اس حوالے سے صالحہ عابد حسین کی خود نوشت کے ان معروضات کا جائزہ لینا مقصود ہے جن کا تعلق خاص طور سے اردو ادب سے ہے۔یہ ضرور ہے کہ اس طرز کے بیشتر معروضات صاحب کتاب کی شخصیت کے اردگرد ہی رونما ہوتے نظر آتے ہیں جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ صالحہ عابد حسین کی شخصیت میں خود نمائی اور نام و نمود حاصل کرنے والے عناصر تقریباً ناپید تھے اور وہ اپنی ریاضت قرطاس کو ہی ادب میں اپنے زندہ رہنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتی تھیں۔

صالحہ عابد حسین کی یہ خود نوشت 1982 میں نئی کتاب پبلشرز، جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع ہوئی۔اس کتاب کی پہلی اشاعت کے 27 برس بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جس میں صغریٰ مہدی کا لکھا ہوا دیباچۂ ثانی اور سیدہ سیدین حمید کا تعارف بھی شامل ہے۔اس خود نوشت کا انتساب صغریٰ مہدی کے نام ہے جو رشتہ میں صالحہ عابد حسین کی بھانجی تھیں اور خود بھی اردو ادب میں ایک مقبول فکشن نگار کی حیثیت رکھتی تھیں۔صغریٰ مہدی نے کئی برسوں تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔زبان و ادب سے ان کے ذوق کو صحیح سمت عطا کرنے میں صالحہ عابد حسین کی رہنمائی کا اہم رول رہا ہے اور اس کا اعتراف خود صغریٰ مہدی نے بھی کیا ہے۔صالحہ عابد حسین نے صغریٰ مہدی کی علم دانی اور ادب فہمی کی ستائش کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے ان کی تدریسی اور ادبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

ان کے خاندان کے اس ماحول میں حالی جیسے قدآور ادیب و شاعر کی فہم و ذکاوت کی وہ وراثت بھی شامل تھی جس نے صالحہ عابد حسین اور ان کی خاندان کے دیگر افراد کو علم و ادب میں ممتاز مقام حاصل کرنے میں معاونت کی۔صالحہ عابد حسین کی والدہ مشتاق فاطمہ، حالی کی پوتی تھیں جن کی شادی ملک کے مشہور دانشور اور سماجی کارکن خواجہ غلام الثقلین سے ہوئی تھی۔اس طرح صالحہ عابد حسین کو اپنی نانیہال اور والد کی جانب سے علم ادب کا ذوق وراثت میں ملا تھا۔حالانکہ وہ والد کے سایۂ شفقت سے بہت جلد محروم ہو گئیں جبکہ ان کی عمر محض سال ڈیڑھ سال تھی لیکن اس کے بعد ان کے بھائی خواجہ غلام السیدین نے ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھنے میں ان کا ساتھ دیا۔بھائی کے سایۂ عاطفت میں رہ کر انھوں نے دستورِ زمانہ کے مطابق روایتی تعلیم حاصل کی اور شعر و ادب کو پڑھنے اور سمجھنے کا سلیقہ بھی سیکھا۔اس کتاب میں صالحہ عابد حسین نے بارہا اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے لڑکپن کو علم وادب کی تابناکی عطا کرنے میں غلام السیدین کا بہت اہم رول رہا ہے ورنہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس دور میں اگر صحیح تربیت نہ ہو تو شخصیت کی نشو و نما کے مراحل پیچیدگی اختیار کر لیتے ہیں۔بھائی نے بہن کے ادبی ذوق کو مہمیز کرنے کے لیے انھیں ادب کی معیاری کتابیں فراہم کیں اور ان کے توسط سے صالحہ عابد حسین کی تخلیقی صلاحیت کو ابھارنے اور نکھارنے میں بھی معاون رہے۔اس کا ذکر یوں تو کتاب میں کئی

مقامات پر ہوا ہے لیکن مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شعور کی بالیدگی اور پختگی کے ابتدائی دور سے ہی بھائی نے بہن کی تربیت کا مخصوص بندوبست کیا اور یہ بندوبست ایسا تھا جس سے طبیعت پر بار گزرنے یا اکتاہٹ محسوس ہونے کی بجائے تفریح و شادمانی کا احساس پیدا ہوتا تھا:

> ''منشی پریم چند کے افسانے پریم پچیسی اور پریم بتیسی کے نام سے اسی زمانے میں شائع ہوئے تھے۔ بھائی جان نے ہم لوگوں کے لیے یہ کتابیں منگائیں۔ رات کو سب کو بٹھا کر قصہ سناتے۔ کبھی کوئی کہانی ایسی سناتے کہ ادھوری معلوم ہوتی۔ وہ ہم سب سے کہتے کہ اس کہانی کو پورا کرو۔ اس ادبی کھیل میں باجی سے لے کر مجھ تک، سب بہن بھائی شریک ہوتے۔ مگر چند دن میں سب کا شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ جو کہانیاں میں نے پوری کیں وہ زیادہ پسند کی گئیں اور اس بہانے منشی پریم چند کو پڑھنے کی چاٹ تو پڑ ہی گئی''۔1

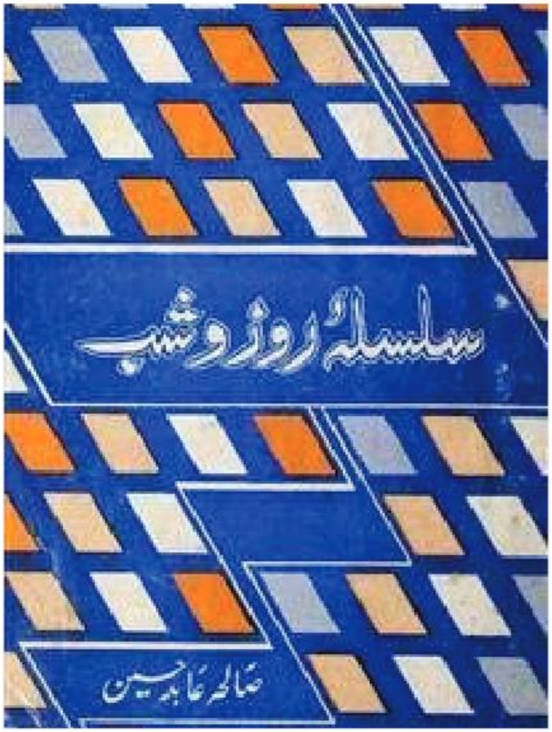

زندگی کے ابتدائی ایام کی اس تربیت نے آگے چل کر صالحہ عابد حسین کو ادب کی دنیا میں قابل قدر مقام دلوایا اور دراصل مطالعہ اور لکھنے پڑھنے کے شوق نے ہی انھیں زندگی کے مثبت پہلو اور حوصلہ افزا افکار کی دولت سے نوازا۔ انھوں نے اردو ادب کی کلاسیکی روایت سے خاصا فیض اٹھایا۔ صالحہ عابد حسین نے اپنی زندگی کی جو تفصیل اس کتاب میں پیش کی ہے اس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر علم و ادب سے انھیں دلچسپی نہ پیدا ہوگئی ہوتی تو ان کی شخصیت ایسی نفسیاتی کجی کا شکار بھی ہو سکتی تھی جو بقیہ زندگی کو پیچیدہ تر بنا دیتی۔ اس سلسلے میں ان کے اہل خانہ کے رفاقت آمیز برتاؤ کو بھی اہمیت حاصل ہے جس کی وجہ سے انھیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کا حوصلہ ملا۔

صالحہ عابد حسین نے اپنی زندگی کی جو تفصیل اس کتاب میں پیش کی ہے اس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر علم و ادب سے انہیں دلچسپی نہ پیدا ہو گئی ہوتی تو ان کی شخصیت ایسی نفسیاتی کجی کا شکار بھی ہو سکتی تھی جو بقیہ زندگی کو پیچیدہ تر بنا دیتی

صالحہ عابد حسین نے اس خودنوشت میں بیشتر اپنی نجی اور گھریلو زندگی کی تفصیل پیش کی ہے جس میں ان کے والدین، بھائی بہنوں، شوہر، دوستوں اور خاندان کے دوسرے افراد کے قصے موجود ہیں اور اسی ذیل میں بعض مقامات پر علم و ادب کی وہ باتیں بھی ضبط تحریر میں آگئی ہیں جن سے مصنفہ کا براہ راست کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے ادب میں کسی بھی گروہ یا جماعت کی نہ تو پیروی کی اور نہ ہی اس کی مخالفت، حالانکہ ان کے زمانے میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کا بڑا دور دورہ رہا اور بعض ارباب ادب نے صرف نام و نمود کی خاطر فکری ہم آہنگی نہ ہونے کے باوصف ان گروہوں میں شامل ہونے کو عار نہیں سمجھا۔ صالحہ عابد حسین کے

معاصر ادبی منظرنامے کو پیش نظر رکھ کر اگر ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انھوں نے ادب کی دنیا میں اپنا جو مقام بنایا اس میں ان کی تخلیقی صداقت اور فن کے تئیں اخلاص و احترام کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ادبی دنیا کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ رہ کر اپنی آواز کی انفرادیت کو واضح کرنا بہت آسان نہیں ہوتا لیکن صالحہ عابد حسین نے اس مرحلے کو بہ حسن وخوبی سر کیا۔ان کے افسانوی مجموعوں اور ناولوں میں فن کی صداقت کے جو مظاہر نظر آتے ہیں ان کے سبب ان تخلیقات کو ادبی حلقے میں اہمیت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

صالحہ عابد حسین کے معاصر ادبی منظرنامے کو پیش نظر رکھ کر اگر ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انھوں نے ادب کی دنیا میں اپنا جو مقام بنایا اس میں ان کی تخلیقی صداقت اور فن کے تئیں اخلاص و احترام کو نمایاں مقام حاصل ہے

سلسلۂ روز وشب کے آخری ابواب میں صالحہ عابد حسین نے اپنی تعلیمی زندگی کی تفصیل نیز ادبی وتخلیقی سرگرمیوں سے وابستہ حقائق قدرے دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔اس کے علاوہ اپنے ان دوستوں کا بھی ذکر اس ضمن میں انھوں نے کیا ہے جو ان کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں معاون رہے یا کہ جن کے افکار وخیالات نے صالحہ عابد حسین کی تخلیقی صلاحیت کو جلا بخشی۔انھوں نے ایک باب 'کتابیں میری زندگی' کے عنوان سے قائم کیا ہے اوراس باب میں اپنے شوق مطالعہ کی تفصیل معلوماتی انداز میں بیان کی ہے۔ان کے اس شوق کو مہمیز کرنے میں ان کے اہل خاندان کے علاوہ ان کے شوہر ڈاکٹر عابد حسین کا نمایاں کردار رہا۔صالحہ عابد حسین نے اس باب میں بتایا ہے کہ انھوں نے اردو شعر و ادب کی معیاری کتابوں کا مطالعہ کرنے کے علاوہ انگریزی کے معیاری ادب کا بھی مطالعہ کیا۔شادی سے قبل اپنے شوق کا احوال بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''عمر کے ساتھ شوق میں ترقی ہوتی گئی۔ ذوق بہتر ہوا۔ سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ کہانیوں اور ناولوں کے ساتھ ساتھ شاعروں کو بھی پڑھنا شروع کیا۔حالی کو تو بہت بچپن سے پڑھا تھا۔انیس تو پڑھے اور سنے ہی جاتے تھے مگر اب مسدس اور بیوہ کی مناجات اور دوسری نظمیں سمجھ میں آتی تھیں اور انیس کے سلام اور مرثیوں کو سمجھنا اور خود تکیہ پر بیٹھ کر پڑھنا شروع ہو چکا تھا۔ پھر اپنے شوق سے میں نے غالب،میر، حسرت، فانی، اختر شیرانی وغیرہ کو پڑھنا شروع کیا۔ میرے پاس اس زمانے کی ایک کاپی ہے جس میں، میں اپنے پسند کے شعر اور نظمیں، غزلیں نقل کیا کرتی تھی۔اس کاپی میں اقبال، حالی، غالب حسرت، اختر شیرانی، فانی اور بعض اور شاعروں کی غزلیں، نظمیں، قطعات اور متفرق اشعار وغیرہ لکھے ہوئے ہیں''۔2

اس باب میں انھوں نے اپنے شوہر عابد حسین کی ادب فہمی سے فیض اٹھانے کا اعتراف بڑے دیانت دارانہ انداز میں کیا ہے اور اسے اپنی خوش بختی قرار دیا ہے کہ شادی کے بعد رفیقۂ حیات کے طور پر انھیں ایسے شخص کی صحبت میسر آئی جو خود بھی علم وادب کا دلدادہ تھا۔اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''شادی کے بعد شعروشاعری کے ذوق میں عابد صاحب کی صحبت میں وسعت پیدا ہوئی۔اب صرف مذہبی یا اخلاقی اور اصلاحی چیزیں ہی نہیں دوسرے قسم کے شاعروں کو بھی پڑھتی سمجھتی اور اپنے انداز میں اس کا ذوق پیدا کرتی رہی۔ پھر آنرز ان اردو کرنے کے زمانے میں تقریباً سبھی کلاسیکل شاعروں کو پڑھا۔قلی قطب شاہ اور ولی سے لے کر ذوق اور میر، اقبال، غالب اور پھر موجودہ دور کے شاعروں کا بہت سا کلام پڑھا۔غالب اور اقبال کے کلام کے بعض حصے اور ذوق اور سودا کے قصائد عابد صاحب نے خود پڑھائے۔3

’اس خود نوشت میں صالحہ عابد حسین نے اپنے تخلیقی سرمایے کا پتہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی شائع شدہ چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد چالیس سے اوپر ہے۔ اس کے علاوہ پھول، تہذیب نسواں، نور جہاں، سہیلی، عصمت، آج کل، نیادور، شمع وغیرہ رسائل میں ان کی متفرق تحریریں شائع ہوئیں اور ارباب ادب سے خاطر خواہ پذیرائی حاصل کی‘

صالحہ عابد حسین کی ادبی شخصیت کو بنانے سنوارنے میں ان کتابوں نے اہم کردار ادا کیا۔ مطالعے کے اس شوق کی تکمیل میں ان کے گرد و اطراف کے ماحول ان کی زندگی سے وابستہ شخصیات نے بھی ان کی مدد کی۔ اس کو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ مطالعہ، تخلیق کی پہلی سیڑھی ہے اور جب شعر و نثر کا مطالعہ وقیع اور ان اصناف کی فنی نزاکتوں سے واقفیت ہو جائے تو افکار کو تخلیقی سانچے میں ڈھالنے کا سلیقہ آتا ہے۔ صالحہ عابد حسین کے اس قدر شوقِ مطالعہ نے ان کے قلم کو قوت اور افکار کو جولانی عطا کی اور خوش قسمتی سے انھیں رفیق حیات کی شکل میں ایسا ادب شناس شخص ملا جس نے ان کے اس ذوق کو جلا بخشی۔ اس خودنوشت کے باب نمبر 21 میں انھوں نے ان اسباب و محرکات کا جائزہ پیش کیا جو ان کی تخلیقی زندگی کے آغاز و ارتقا میں اہمیت کے حامل رہے۔ اس باب کا عنوان انھوں نے ’خامہ فرسائی، کیوں؟ کب سے؟ کیسے؟‘ قائم کیا ہے۔ اس باب کا آغاز قدرے ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے اور اپنی زود نویسی اور بسیار نویسی کا جواز پیش کرتے ہوئے انھوں نے ایک دلچسپ فقرہ یہ بھی لکھا ہے کہ جب میں یہ غور کرتی ہوں کہ لکھنا کب سے شروع کیا تو بعض دفعہ یہ لگتا ہے کہ جیسے پڑھنے سے پہلے ہی میرے لکھنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس فقرہ کی حقیقت بس اسی قدر ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کی مصروفیات، مختلف قسم کی بیماریوں اور الجھنوں میں مبتلا ہونے کے باوجود تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کے ذیل میں جو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں اس کا کوئی جواز پیدا ہو سکے۔

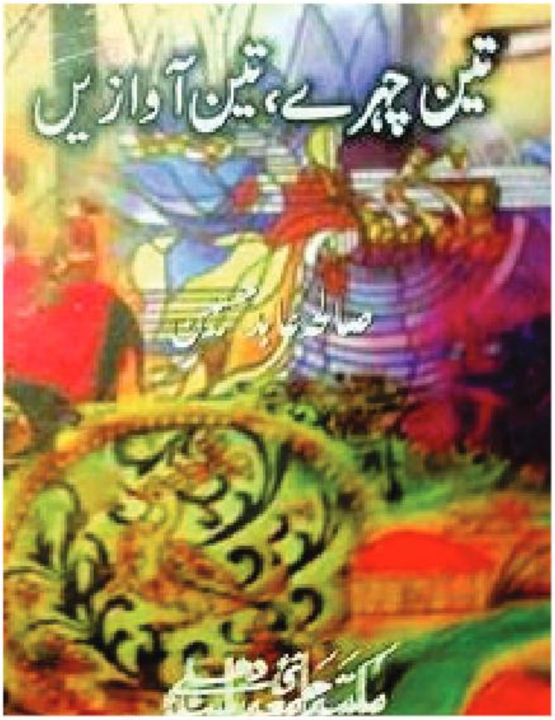

اس خودنوشت میں صالحہ عابد حسین نے اپنے تخلیقی سرمایے کا پتہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی شائع شدہ چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد چالیس سے اوپر ہے۔ اس کے علاوہ پھول، تہذیب نسواں، نور جہاں، سہیلی، عصمت، آج کل، نیادور، شمع وغیرہ رسائل میں ان کی متفرق تحریریں شائع ہوئیں اور ارباب ادب سے خاطر خواہ پذیرائی حاصل کی۔ ان کے گھر کا ماحول خالص علمی و ادبی ماحول تھا اور اس ماحول کے پروردہ افراد میں علم و ادب کا ذوق ہونا فطری ہے۔ صالحہ عابد حسین کے گھر کے مردوں کے علاوہ خواتین بھی اپنی تحریری صلاحیتوں کا اظہار گاہے گاہے کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے سلسلۂ روز و شب میں اس بابت لکھا ہے:

”لکھنے کا شوق صرف مردوں ہی میں نہ تھا۔ میری ایک پھوپی نے میری پیدائش سے بہت پہلے ظل السلطان وغیرہ میں مضمون لکھے تھے۔ بڑی بہن فاطمہ زیدی بہت

اچھی شاعرہ تھیں۔ منجھلی بہن سیدہ خاتون رسالوں میں مضمون بھی لکھتی تھیں اور فارسی کی ایک کتاب 'دوستداران بشر' کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا''۔4

صالحہ عابد حسین کو نہ صرف اپنی گھریلو زندگی میں یہ ماحول ملا بلکہ ان کی سماجی زندگی میں بھی جن لوگوں سے ان کی قربت رہی انھیں ادب میں مختلف حوالوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس خودنوشت میں انھوں نے اپنے ان دوستوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی ادبی شخصیت کو نمایاں کرنے میں فکری یا عملی طور سے ان کے معاون رہے۔انھوں نے اپنے دوستوں میں رضیہ سجاد ظہیر (سجاد ظہیر کی بیوی)،صفیہ اختر،قدسیہ زیدی،آصفہ مجیب اور بیگم انیس قدوائی کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے اور ان کے حوالے سے اس زمانے میں خواتین کی ادبی سرگرمیوں کا محاکمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ان دوستوں کے علاوہ صالحہ عابد حسین کے بھائی غلام السیدین کو بھی اردو ادب میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔غلام السیدین اپنی خود نوشت 'مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں' کے حوالے سے ادب میں مشہور ہوئے لیکن وہ اس خودنوشت کو مکمل کرنے سے قبل ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے لہٰذا اس کا دوسرا حصہ صالحہ عابد حسین نے لکھا۔

صالحہ عابد حسین کی اس خودنوشت کی مقبولیت کا خاص سبب اس کا وہ سادہ وسلیس طرز بیان ہے جو حقائق کی ترجمانی بڑے دل پذیر انداز میں کرتا ہے۔ اسلوب کی اس سادگی میں کہیں کہیں زبان و بیان کی پرکاری بھی نظر آتی ہے خصوصاً ان مقامات پر جہاں صالحہ عابد حسین نے عورتوں کی روزمرہ گفتگو اور محاوروں کا استعمال برجستہ انداز میں کیا ہے۔ اس خودنوشت کے منصۂ شہود پر آنے سے قبل وہ ایک صاحب طرز نثر نگار کے طور پر اپنی شناخت بنا چکی تھیں۔

سلسلۂ روز وشب کی سادہ وشگفتہ نثر اس کی مقبولیت کی اہم وجہ ہے۔ اس میں ادبی موضوعات پر مبنی فلسفیانہ مباحث بھلے ہی نہ ملتے ہوں لیکن صالحہ عابد حسین نے اپنے ادبی ذوق اور تخلیقی سرگرمیوں کے حوالے سے جو معروضات پیش کیے ہیں وہ ان کے ادبی موقف کی کسی قدر وضاحت ضرور کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے عہد میں ادبی دنیا کے رجحانات اور اس دنیا کی رونق میں اضافہ کرنے والی بعض شخصیات کا احوال بیان کرتے ہیں۔ان کی یہ خودنوشت مشرقی اقدار حیات کی پابند ایک خاتون کے ادبی ذوق اور اردو ادب کو مقبول بنانے کی ان کی کوششوں سے عبارت ہے۔

حوالہ جات

1۔ سلسلۂ روز وشب، صالحہ عابد حسین،، نئی کتاب پبلشرز، نئی دہلی، بار دوم ستمبر 2009،ص:51
2۔ ایضاً،ص:210
3۔ایضاً،ص:201
4۔ ایضاً،ص:207

❒❖❒

Dr. Roshni Khan
Flat No 14 , C Wing, Building No. 1,
Humera Park, Pathanwadi,
Malad (East)
Mumbai - 400 097
Mobile No. 9967694393

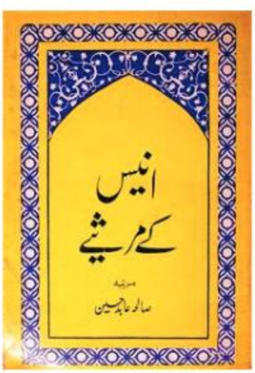

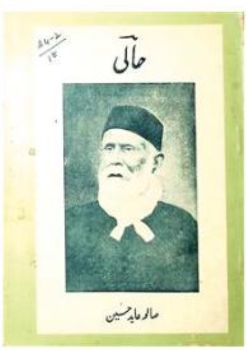

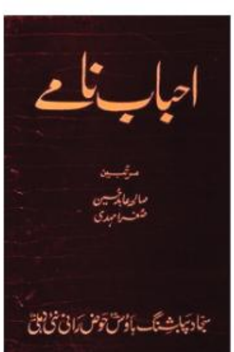

عاتکہ ماہین

عہد حاضر میں نظم نگار خواتین

نظم ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں بلا کی وسعتیں ہیں ۔ یہ کسی بھی قسم کے موضوع کو اپنانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ جدید نظم کا آغاز محمد حسین آزاد اور حالی کے ہاتھوں ہوا۔عہد بہ عہد موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے اس صنف میں تبدیلی واقع ہوتی رہی۔اور کثیر تعداد میں شعراوشاعرات نے اس صنف کو ذریعہ اظہار بنایا۔موجودہ دور میں ادبی منظرنامے پر ابھرنے والے شعراوشاعرات کسی مخصوص نظریاتی تنظیم یا ادبی گروہ سے وابستگی ظاہر کرنے کے بجائے آزادانہ طور پر اپنے تجربات و مشاہدات اور جدید حسیت کو بروئے کار لاتے ہوئے تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

اب نہ تو ترقی پسند تحریک کا غلبہ برقرار ہے نہ ہی حلقہ ارباب ذوق اور جدیدیت کا دبدبہ،آج کے فنکار کی فکر کا دائرہ کسی ایک نقطے پر مرکوز نہیں رہا بلکہ وہ سماج کے چھوٹے بڑے ہر واقعے سے اپنے ذہن کے لیے مناسب غذا حاصل کر لیتا ہے اور ساتھ ہی اپنی روایتوں کی پاسداری کو بھی ترجیح دیتا ہے۔

تقسیم کے بعد منظر عام پر آنے والی شاعرات نے اپنے سامنے درپیش مسائل مثلاً ذات کی دریافت،آزادی اظہار،تشخص کا مسئلہ وغیرہ کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور ان تمام مسائل سے نبردآزما ہوتے ہوئے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب بھی ہوئیں۔ادھر تین چار دہائیوں میں شاعری کرنے والی خواتین میں رفیعہ شبنم عابدی ،بلقیس ظفیر الحسن اور شہناز نبی نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔انھوں نے کسی مخصوص نقطہ نظر کو اپنانے کے بجائے مکمل طور سے زندگی کی ترجمانی کو اولیت دی۔تینوں شاعرات کو ایک ہی عہد سے سروکار ہے۔ایک ہی جیسے سیاسی ،سماجی ماحول کو انھوں نے دیکھا البتہ ان کا طرز احساس مختلف ہے۔ان کے موضوعات مشترک بھی ہیں اور جداگانہ بھی اور ان کے برتنے کا انداز بھی علیحدہ ہے۔البتہ نسائی حسیت ان تینوں شاعرات کے یہاں موجود ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی: ۔رفیعہ عہد حاضر کی تعلیم یافتہ شاعرہ ہیں۔ان کی شاعری کا آغاز نظموں کے ذریعے ہوا۔لیکن انھوں نے غزل، رباعی اور قطعات بھی کہے ہیں۔شاعری کے علاوہ رفیعہ کی تنقیدی ، تحقیقی کتابیں اور ناول بھی منظرعام پر آچکے ہیں۔ان کے چار شعری مجموعے 'موسم بھیگی آنکھوں کا' (1985)'اگلی رت کے آنے تک' (1994) 'آنگن آنگن پروائی' (2009)'نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں' (2009) میں اشاعت پذیر ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ شاعری سے متعلق اپنے مجموعے اگلی رت کے آنے تک میں لکھتی ہیں۔

''شاعری میرے لیے ایک اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں اسے کسی قسم کے water right compartmants میں بانٹنے کی قائل نہیں شاید اسی لیے شاعری کے کسی مخصوص ذہنی رویے یا فکری دبستان سے میری کوئی وابستگی نہیں۔ میں ترقی پسند ہوں اس لیے کہ ترقی کو پسند کرتی ہوں۔ جدیدیت سے میرا تعلق ہے اس لیے کہ جدت فکر کو اہمیت دیتی ہوں اور روایت پرست ہوں اس لیے کہ روایت سے انحراف میرا شیوہ نہیں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں ایک عورت ہوں۔ ایک مشرقی ہندوستانی عورت! جس سماج میں، جس معاشرے میں اور جس گھر میں زندگی گزار رہی ہوں اسی معاشرے اسی سماج اور اسی گھر کی تصویریں میری شاعری میں ملتی ہیں اور یہی میرے لیے سبز رتوں کی بشارت ہے۔''

(محاسبہ: مشمولہ اگلی رت کے آنے تک از رفیعہ شبنم عابدی: ص 6)

مذکورہ قول کے مطابق رفیعہ ایک مشرقی عورت ہیں اور ان کی شاعری میں ان کی مشرقیت پوری طرح رچی ہوئی ہے۔ انھوں نے کسی اصلاحی و اخلاقی مقصد کی تکمیل کے لیے شاعری نہیں کی بلکہ ان کے مدھم اور نازک جذبات کی تپش سے موضوعات کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ حقیقت اور تخیل کی آمیزش سے انھوں نے اپنی نظموں کی بنیاد قائم کی۔ جب کبھی خوفزدہ ہوتی ہیں تو تخیل کا سہارا لے کر چاند سے ہم کلام ہو جاتی ہیں۔

چاند!
تم روشنی کا پیکر ہو
میرے ویران دل کے آنگن میں
روز اترتے ہو مسکراتے ہو
روح میں تازگی سی لاتے ہو
اور ان خواب ناک آنکھوں میں
پیار کی روشنی بڑھاتے ہو
پھر کہیں دور کھو سے جاتے ہو
چاند!
کیوں اتنی دور رہتے ہو؟
ایک ننھی سی آرزو بن کر
میرے دل میں کہیں سما جاؤ
یہ اندھیرے بہت ڈراتے ہیں
چاند! اب میرے پاس آ جاؤ!

گویا شاعرہ فطرت میں پناہ گزیں ہونے کی خواہش رکھتی ہیں، انھوں نے اس نظم میں رومان پرور فضا خلق کی ہے۔ ان کی گفتگو چاند سے ہے اور چاند کے پس منظر میں وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہیں۔ چاند فطری مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ محبوب کا استعارہ بھی ہے۔ شاعرہ اپنے محبوب کی قربت کی تمنائی ہیں یہاں اندھیروں سے مراد رات کی تاریکی بھی ہو سکتی ہے اور زمانہ کے مصائب و آلام بھی ہو سکتے ہیں دونوں صورتوں میں شاعرہ کو کسی سہارے کی طلب ہے۔ اسی طرح انھیں آسمان، بادل، بارش، پھول، رنگ، ہوا اور موسم سبھی کچھ بے حد پسند ہیں اور ان کے چاروں شعری مجموعوں میں استعمال کیے گئے الفاظ بھی فطرت سے ہی مستعار ہیں۔ موسم بھیگی آنکھوں کا، اگلی

رت کے آنے تک، آنگن آنگن پروائی، نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں۔

رفیعہ کی نظموں سے ان کی نسائی حسیت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ انھوں نے عورت کو کمتر مخلوق سمجھی جانے والی اس معاشرے میں اس کی بے چارگی کو مختلف زاویوں سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے تشخص کی بحالی اور وجود کو منوانے کا مطالبہ کیا ہے۔ اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی ہے لیکن انھوں نے مخالف جنس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ رہنے کی بھی آرزومند ہیں اور اس کی رفاقت سے دستبردار نہیں ہونا چاہتیں۔ مرد و زن کے اشتراک سے دنیاوی امور کو انجام دینے پر یقین رکھتی ہیں۔

اپنی پاکیزہ تمناؤں کی تکمیل کا حق ہے مجھ کو
اپنے معصوم سے جذبات کی ترسیل کا حق ہے مجھ کو
یہ زمیں میری بھی یہ دشت و چمن میرے بھی
ماہ و انجم بھی مرے، نیلا طبق میرا بھی
جتنا ان پر ہے تمھارا، وہی حق میرا بھی
شرط بس یہ ہے
کہ تم ساتھ رہو
پاس رہو
میری ہر مرضی میں شامل ہو تمھاری مرضی
میری ہر سانس کی شاہد ہوں تمھاری سانسیں
میرے ہر راز کی حامل ہو تمھاری دھڑکن
اور ہم ایک ہی زنجیر میں پابستہ ہوں!

(شرط رفاقت)

مذکورہ نظم میں شاعرہ مساوات کی دعویداری تو کرتی ہیں لیکن اپنے شریک سفر کے ساتھ رہتے ہوئے کرتی ہیں اس سے علیحدگی ان کو گوارا نہیں، ماہ و انجم اور نیلے طبق پر اپنا تصرف چاہتی ہیں لیکن ان منازل سے اکیلے نہیں گزرنا چاہتی نیز ان کا لہجہ بھی نرم ہے، باغیانہ لب و لہجے اور شدت پسندی سے انھوں نے گریز کیا ہے۔

بلقیس ظفیر الحسن:۔ موجودہ دور کی شاعرات میں ایک اہم نام بلقیس ظفیر الحسن کا ہے۔ ان کی دلچسپی کا میدان شاعری کے علاوہ کہانی اور ڈرامہ بھی ہے۔ لیکن شاعری کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے 'گیلا ایندھن' (1994) اور 'شعلوں کے درمیان' (2004) ان کی شاعرانہ لیاقتوں کی سند ہیں۔ انھوں نے نظمیں اور غزلیں دونوں کہی ہیں۔ نثری نظموں کی تعداد ان کے یہاں زیادہ ہے۔

بلقیس کا شعری رویہ قدرے مبہم ہے۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی تہذیب کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ ہندی لفظیات کا استعمال کر کے اپنی شاعری کو ہندوستانی تہذیب سے ہم آمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی بعض نظموں کے عناوین قرآنی آیات پر رکھے ہیں نیز اکیسویں صدی میں سائنسی ترقیات کے ایجاد کردہ تکنیکی آلات کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور اس کے حوالے سے انسانی زندگی کے روزمرہ کے حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔ بلقیس اس دنیا کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھتی ہیں اور ملک کی تباہی و بدحالی، فسادات، قتل و غارت گری ان کی روح کو مضطرب کرتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے ملک کے ناگفتہ بہ حالات بلکہ بیرون ملک اور خاص کر عراق کی تباہی کو ایک خاص نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ نظم ''عراق'' میں استعارہ و علامت کے ذریعے جنگ کی تباہ حالی کی امیج سازی کی ہے۔

بلقیس کی شبیہ ایک ایسی شاعرہ کے طور پر قائم ہوتی ہے جن کا نسائی حسیت بہت بیدار ہے۔ ان کے یہاں عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور غیر مساویانہ رویوں کے خلاف احتجاج کی لے ابھرتی ہے۔ حالانکہ بغاوت ان کا شیوہ نہیں لیکن عورت کے ساتھ نابرابری کا کوئی بھی واقعہ ہو اس کے اظہار میں ان کا لب و لہجہ طنزیہ ہو جاتا ہے۔ ایک روایتی معاشرے میں عورت کی جو امیج ہے بلقیس نے اس کو نشان زد کیا ہے کہ کس خوبصورتی سے عورت کو سبز باغ دکھا کر اس کے حقوق سلب کئے جاتے ہیں۔ گھر کی مالکن ہوتی ہے لیکن ایسی مالکن جس کے نصیب میں راحت و آرام نہیں، نظم 'ہاؤس وائف' اسی نوع کی ہے۔

میری ماں مالکن گھر کی کہلاتی تھی اور اسے

عمر بھر اپنے گھر میں کہیں اک جگہ نا ملی
گھر کے سب لوگ آرام سے پیر پھیلا سکیں، اس لیے
عمر بھر پاؤں اپنے سکوڑے رہی
اور اسی حال میں ۔۔۔۔۔۔ایک دن مرگئی۔

پیر پھیلانا کشادگی اور سکوڑنا تنگی کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔نظم سے عیاں ہے کہ ایک ماں کس طرح ہمیشہ دوسروں کے چین و سکون کی خاطر اپنی ضرورتوں کو اپنے سکون و آرام کو تج دیتی ہے اور خود کو گھر کے تمام افراد کی خدمت کے لیے وقف کر دیتی ہے۔شاعرہ نے گرچہ خاص طور سے ماں کا ذکر کیا ہے لیکن لفظ ماں تمام عورتوں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ یہاں لفظ مالکن بطور طنز استعمال ہوا ہے۔

شہناز نبی:۔ رفیعہ شبنم عابدی اور بلقیس ظفیر الحسن کے علاوہ عہد حاضر کی ایک شاعرہ شہناز نبی کا شعری رویہ بھی اہل ادب کی توجہ کا مرکز ہوا ہے۔شاعری کے علاوہ تنقید نگاری بھی ان کی ادبی سرگرمیوں کا حصہ ہے۔شہناز کا رشتہ اردو شاعری سے 80 کی دہائی کے بعد استوار ہوتا ہے ۔انھوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف کو اپنی شاعری کا میدان بنایا ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ'بھیگی راتوں کی کتھا'غزلوں پر مشتمل ہے باقی دو مجموعے'اگلے پڑاؤ سے پہلے' (2001)اور'پس دیوار گریہ'(2008)نظموں کے مجموعے ہیں۔

ان کی شاعری عصری حسیت کی ترجمان ہے۔سماج میں وقوع پذیر ہونے والے تمام عوامل پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔انسانیت سوز حادثات ان کے اندرون میں اضطراب پیدا کرتے ہیں اور پھر وہیں سے نظم موزوں ہو جاتی ہے ۔ان کی شاعری رومان سے گزرتے ہوئے حقیقت کی تہوں تک پہنچ جاتی ہے۔شاعرہ کا عہد80 کی دہائی کے بعد کا ہے جہاں کسی مخصوص ازم کا امکان باقی نہیں لہذا شہناز نبی کی شاعری میں کسی مخصوص نظریاتی فکر کی تلاش بے سود ہے۔

شہناز کے یہاں ایک ایسی لڑکی کی تصویر ابھرتی ہے جو عشق کی کیفیات اور ہجر و وصال کے تجربات سے گزر رہی ہے اور اس کے عشق کی انتہا محبوب (محبوب دوست یا وطن بھی ہوسکتا ہے) کی یاد میں آنسوں بہانے سے ظاہر ہوتی ہے۔

برسوں سے راہ و رسم نہیں تھی ہمارے بیچ
اس کو تلاش تھی نہ ہمیں انتظار تھا
بیچ بیچ کے دور دور گزرتی رہی تھی وہ
کترا کے اس سے ہم بھی نکل جاتے تھے مگر
برسوں پہ کل جو لمحہ فرصت ہوا نصیب
ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر یوں رو پڑے
خود کو سنبھال پائی
نہ ہم کو ہی
تیری یاد۔

(گھائل کی گت)

مذکورہ نظم میں تمثیلی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے گویا طویل عرصے سے محبوب کی یاد نہ آئی۔موجودہ عہد میں ہر شخص کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ کسی کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔عاشق کے دل میں اپنے محبوب سے بچھڑنے کا اس کی جدائی کا غم پیوست ہے لیکن چونکہ عاشق نئے دور کا ہے اس کی زندگی دیگر امور میں الجھ کر اس قدر مصروف ہوگئی ہے کہ محبوب کا غم پس پشت جا پڑا ہے۔اور جب عرصہ دراز کے بعد فرصت کا لمحہ میسر ہوا ہے تو محبوب کی یاد نے پھر سے انگڑائی لی ہے اور اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو جاری ہوگئے۔یہاں انھوں نے اپنے تخلیقی تجربے کو درد و غم کی امیجری کے ذریعے پیش کیا ہے۔

شہناز نبی روایت شناس بھی ہیں اور جدّت پسند بھی۔ان کے نزدیک زندگی میں آگے بڑھ جانے یا ارتقا پذیر ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ روایت کے منکر ہو جائیں۔موجودہ عہد میں عالمی سطح پر ہونے والے فسادات،افراتفری کا ماحول،انسانیت کشی،آدمی کی ارزانیت اور اقدار کی شکستگی ان کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔آج کے دور میں انتشار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ہر شخص ذہنی الجھن کا شکار ہے اور ساری دنیا میں جیسے ایک بھونچال مچا ہوا ہے۔یہ صرف آج کا المیہ نہیں ہے بلکہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ ایسے واقعات و حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں جن سے انسانی سکون تباہ ہوتا ہے۔خواہ ان

واقعات کا تعلق مذہب سے ہو،سیاست سے ہو معاشی سطح پر ہو یا دیگر کسی امر سے، نظم ''امن'' میں شہناز امن کی متلاشی نظر آتی ہیں اور اس نظم کا سلسلہ انھوں نے ماضی کے کئی ایسے مشہور سانحات سے جوڑ دیا ہے جن کی دہشت آج بھی انسانی ذہنوں میں برقرار ہے۔ان سانحات کا تعلق کسی ایک خطے،ایک سرزمین سے نہیں ہے بلکہ ساری دنیا میں وقوع پذیر ہوئے ہیں جن کی وجہ سے امن کا جنازہ نکلا ہے۔

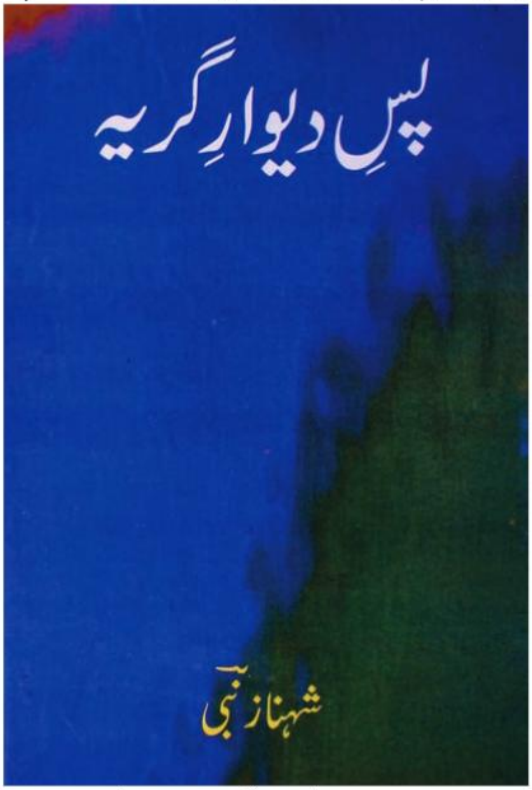

اسے ہم ڈھونڈنے تو نکلے ہیں/مگر پہچانیں گے کیسے/جنگ بدر و احد سے/واقعہ کربلا تک/ہیروشیما/ناگاساکی/فلسطین و عراق تک/سفید کبوتروں کے جھنڈ میں/زیتون کی شاخوں میں/علم ابیض میں/کہیں تو ہے وہ/ذائقہ دار/کھانوں میں/عالیشان ایوانوں میں/پھولوں کے دستوں میں/کاغذ کے/بستوں میں/قلم کی روشنائی میں/لفظوں کی تنہائی میں/کہیں بھٹک رہا ہے وہ/ نسلوں کے جھگڑے زبانوں کے قصے/رنگوں کے کھیل/سرحد کے فعل/اس کے آڑے آرہے ہیں/اب اس دنیا کی ہر حسین شئے کی/جس کا ہم نام/نہیں جانتے/روکیں گے اور پوچھیں گے/تمہارا نام امن تو نہیں۔

مذکورہ نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہناز نبی کی نگاہ ملکی حدود کو عبور کر کے عالمگیری سطح تک جا پہنچتی ہے۔نظم میں طنزیہ پہلو پوشیدہ ہے کہ تمام عالم کے کسی بھی خطے میں کہیں بھی امن و سکون باقی نہیں رہا علاوہ ازیں شہناز کی نظموں میں نسائی حسیت کی کارفرمائی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔گزشتہ ادوار کے بالمقابل موجودہ عہد میں نسائی ادب کو اعتبار حاصل ہوا ہے۔ اس کی تصدیق ان تینوں شاعرات کے کلام کے اس مختصر مطالعے سے ہوتا ہے۔موجودہ عہد کی شاعرات اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتیں ان کی نظمیں ان کی ذہنی بلندیوں اور گہرے حسی تجربات کو پیش کرتی ہیں۔نئی شاعرات کے متعلق حامدی کاشمیری لکھتے ہیں کہ۔

> ''نئی خواتین شعرا کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت محض مرد کی جنسی تسکین کا ذریعہ نہیں، بلکہ وہ خود جنسی آگہی کے اثبات واظہار کا استحقاق رکھتی ہے۔ وہ عشق کو سستی جذباتیت و رومانیت میں بدلنے کے بجائے اسے سماجی پس منظر میں ایک جسمانی حقیقت کے رویے میں دیکھتی ہے،مزید وہ مرد کی ہی طرح اپنے ذہنی،نفسیاتی اور روحانی تقاضوں سے باخبر ہے،اوران کی تکمیل چاہتی ہے۔''

(جدید اردو نظم پر یوروپی اثرات؛ حامدی کاشمیری،ص518)

گویا ان شاعرات نے ماضی میں عورت سے متعلق قائم نظریات و تصورات کو مٹا کر عورت کو ایک مکمل وجود کے طور پر پیش کیا ہے اور اپنی علیحدہ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔انھوں نے اپنی بصیرت اورادراک سے وہ اعتماد حاصل کرلیا ہے کہ انھیں تنقید کی دنیا میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

❑❖❑

Atika Maheen
C/o. Mohammad Murtaza Husain
Civil Line Azam And Company
Bilthara Road Ballia-221715(U.P)

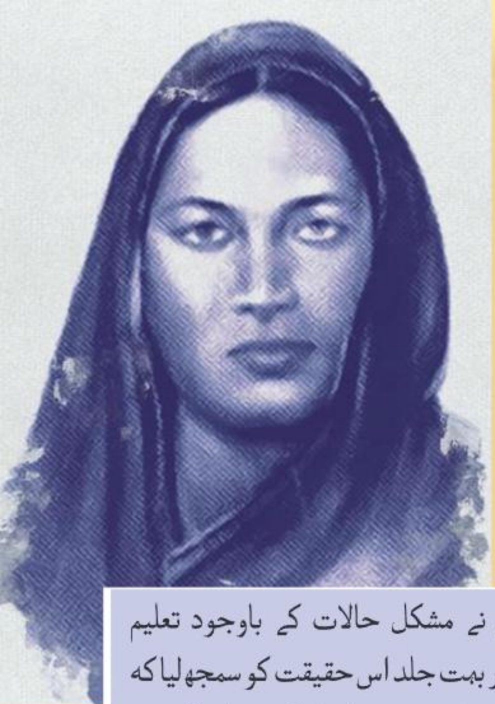

راشدہ خاتون

فاطمہ شیخ

گمنامی سے ابھرتی ہوئی ایک عظیم سماجی آواز

> "فاطمہ شیخ نے مشکل حالات کے باوجود تعلیم حاصل کی اور بہت جلد اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ علم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو انسان کو پسماندگی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتا ہے۔ فاطمہ شیخ کی زندگی میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب ان کی ملاقات مہاتما جوتی با پھلے اور ساوتری بائی پھلے سے ہوئی۔ یہ دونوں شخصیات ہندوستان میں سماجی اصلاح اور تعلیمی بیداری کے علمبردار تھے"

تاریخِ انسانی کا مطالعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ ہر عہد میں کچھ ایسی شخصیات ضرور پیدا ہوتی ہیں جو سماج کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں مگر بدقسمتی سے ان کی خدمات کو وہ recognition نہیں مل پاتا جس کی وہ حقیقی طور پر مستحق ہوتی ہیں۔ اگر ہم انیسویں صدی کے ہندوستانی سماج پر نظر ڈالیں تو یہ وہ دور تھا جب تعلیم، بالخصوص خواتین کی تعلیم، ایک challenge سمجھی جاتی تھی۔ ذات پات، مذہبی تفریق اور سماجی پابندیاں اس قدر مضبوط تھیں کہ ایک عام انسان کے لیے بھی اس سے نکلنا آسان نہ تھا۔ اور ایسے میں کسی خاتون کا آگے بڑھ کر تعلیمی اور سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھانا، ایک انقلابی قدم (Revolutionary step) سے کم نہ تھا۔

اسی پس منظر میں ایک ایسی شخصیت سامنے آتی ہے جس نے خاموشی کے ساتھ مگر نہایت مؤثر انداز میں سماج کی خدمت کی۔ وہ شخصیت ہے 'فاطمہ شیخ' کی۔ انھوں نے نہ صرف پونے میں لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا بلکہ تعلیم کو creed,caste and religion سے بالاتر ہو کر عام کرنے کی ایک عملی مثال بھی پیش کی۔ یہ امر نہایت قابلِ غور ہے کہ اتنی عظیم خدمات کے باوجود فاطمہ شیخ کا نام تاریخ کے نمایاں صفحات میں کم ہی نظر آتا ہے۔ گویا وہ ایک ایسی خاموش تحریک (silent movement) کا حصہ تھیں، جس کی گونج تو موجود ہے، مگر آواز کو مکمل طور پر سنا نہیں گیا۔

فاطمہ شیخ 9 جنوری 1831 کو پونے مہاراشٹر کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اس دور کا سماجی ڈھانچہ نہایت پیچیدہ اور غیر مساوی تھا۔ خواتین کو نہ صرف گھریلو دائرے تک محدود رکھا جاتا تھا بلکہ ان کی تعلیم کو غیر ضروری بعض اوقات نقصان دہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح نچلے طبقات، خصوصاً دلت اور بہوجن کمیونٹیز کو بھی تعلیم کے بنیادی حق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں کسی خاتون کا تعلیم حاصل کرنا اور پھر دوسروں کو تعلیم دینے کا عزم کرنا، ایک غیر معمولی اور انقلابی قدم تھا۔

فاطمہ شیخ نے مشکل حالات کے باوجود تعلیم حاصل کی اور بہت جلد اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ علم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو انسان کو پسماندگی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کرسکتا ہے۔ فاطمہ شیخ کی

زندگی میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب ان کی ملاقات مہاتما جوتی با پھلے اور ساوتری بائی پھلے سے ہوئی۔ یہ دونوں شخصیات ہندوستان میں سماجی اصلاح اور تعلیمی بیداری کے علمبردار تھے۔ ان کی تحریک کا بنیادی مقصد ذات پات کے نظام کو چیلنج کرنا اور خواتین و پسماندہ طبقات کو تعلیم کے ذریعے بااختیار بنانا تھا۔ فاطمہ شیخ اس تحریک سے نہ صرف متاثر ہوئیں بلکہ اس کا عملی حصہ بن گئیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ایک عام خاتون ایک غیر معمولی سماجی کارکن بن گئی۔

1848 میں پونے کے علاقے بھڑے واڑہ میں لڑکیوں کے لیے پہلا اسکول قائم کیا گیا، جو ہندوستانی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اسکول کے قیام میں فاطمہ شیخ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ ادارہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انقلابی تھا، کیونکہ یہاں ذات، مذہب اور سماجی حیثیت کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ ہر خاتون کو تعلیم حاصل کرنے کا برابر حق حاصل تھا۔

اس تاریخی اقدام کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے اگر ہم مستند ماخذ کی طرف رجوع کریں تو ڈاکٹر نسرین رمضان سید کی کتاب 'فاطمہ شیخ اور سلطانہ چاند بی بی' میں اس حوالے سے ایک نہایت معنی خیز مکالمہ نقل کیا گیا ہے، جو اس تحریک کے عزم اور فکر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ ساوتری بائی پھلے، جوتی با پھلے، فاطمہ شیخ اور شیخ عثمان کے درمیان اسکول کے قیام سے متعلق ہونے والی گفتگو پیش خدمت ہے:

''بھڑے واڑہ میں لڑکیوں کے لیے پہلا مدرسہ جیوتی با پھلے نے کھولا۔ اس اسکول میں چند ہی دنوں میں لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ بھڑے واڑے کے اسکول اور دوسرے اسکولوں میں بھی لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تب جیوتی با نے سوچا کہ یہیں آس پاس یعنی گنج پیٹھ (جسے اس زمانے میں پیٹھ گنج کہا جاتا تھا) میں ان کے گھر کے قریب ایک اور اسکول کھولا جائے لیکن اسکول کے لیے جگہ کا مسئلہ کھڑا ہو گیا، اسکول کے لیے جگہ ضروری تھی، اس لیے تب وہ اپنے دوست اور فاطمہ شیخ کے بھائی عثمان شیخ کے پاس گئے اور انھیں یہ بتایا کہ

''میں یہاں ایک اسکول کھولنا چاہتا ہوں''

عثمان شیخ اور ان کے والد نے پوچھا،

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے، اس علاقے میں اسکول کھلے گا تو یہاں کی لڑکیاں بھی اسکول میں پڑھ سکیں گی۔ اس میں دقت کی کیا بات ہے؟''

جیوتی با نے انھیں بتایا،

''اس کام میں ایک دقت آرہی ہے اسی لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔''

عثمان شیخ نے پوچھا،

''کیا ہم کچھ مدد کر سکتے ہیں؟'' جوتی با نے کہا،

''مدد تو آپ ہی کر سکتے ہیں۔ پہلے بھی مصیبت کے وقت میں آپ نے میری اور ساوتری کی مدد کی تھی۔ دوست: میں تمھارا یہ احسان کبھی چکا نہیں سکتا''

عثمان شیخ نے کہا،

''دوست بھی کہتے ہو اور احسان کی بات بھی کرتے ہو۔ جوتی یہ ٹھیک نہیں ہے۔ خیر چھوڑو یہ سب باتیں۔ یہ تو بتاؤ کیسی مدد چاہتے ہو ہم سے۔''

جوتی با نے بتایا،

''مجھے گنج پیٹھ میں ایک اسکول کھولنا ہے اس کے لیے جگہ درکار ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم ہی مجھے جگہ مہیا کر سکتے ہو۔''

عثمان شیخ نے کہا،

''جوتی با تم تو حد ہی کر دیتے ہو۔ ذرا سی بات۔ اور تم نے کتنی لمبی تمہید باندھی۔ سمجھ لو جگہ میں نے دے دی۔ کیوں ابا جان؟''

ان کے والد نے کہا،

''اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے۔ نیک کام ہے اس میں ہماری بھی تھوڑی سی مدد تمھیں ملے گی تو یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔''

جوتی با کہنے لگے،

''میں اور ساوتری کئی دنوں سے اسکول کو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے

پریشان ہو گئے تھے آپ نے تو چٹکی میں اسے حل کر دیا۔ شاید آپ نہ ہوتے تو یہ اسکول کبھی کھل نہ پاتا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

فاطمہ شیخ اسی اسکول میں بطور معلمہ خدمات انجام دیتی رہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ تعلیم کے مشن کو آگے بڑھاتی رہیں۔ خاص طور پر مسلم اور پسماندہ طبقات کی لڑکیوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنا ان کی نمایاں خدمات میں شامل ہے۔ وہ ہندوستان کی اولین مسلم خاتون اساتذہ میں شمار کی جاتی ہیں، جنھوں نے عملی طور پر تعلیمی مساوات کا خواب حقیقت میں بدلنے کی کوشش کی۔

''فاطمہ شیخ نے نہ صرف تدریس کے میدان میں خدمات انجام دیں بلکہ خواتین کے حقوق، خودمختاری اور وقار کے لیے بھی آواز بلند کی۔ وہ اس بات پر یقین رکھتی تھیں کہ تعلیم کے بغیر کوئی بھی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا''

فاطمہ شیخ، ساوتری بائی پھلے اور جوتی با پھلے کے ساتھ مل کر ایک ایسی تحریک کا حصہ بنیں جس نے سماج کے بنیادی ڈھانچے کو چیلنج کیا۔ انھوں نے تعلیم سے محروم طبقات کے لیے علم کے دروازے کھولے۔ یہ تحریک محض تعلیمی نہ تھی بلکہ ایک وسیع سماجی اصلاحی مہم تھی، جس کا مقصد انسانوں کے درمیان مساوات، انصاف اور احترام کو فروغ دینا تھا۔ فاطمہ شیخ نے نہ صرف تدریس کے میدان میں خدمات انجام دیں بلکہ خواتین کے حقوق، خودمختاری اور وقار کے لیے بھی آواز بلند کی۔ وہ اس بات پر یقین رکھتی تھیں کہ تعلیم کے بغیر کوئی بھی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ یہ جدوجہد ہرگز آسان نہ تھی۔ اس دور کے قدامت پسند سماج نے اس تحریک کی شدید مخالفت کی۔ فاطمہ شیخ اور ان کے ساتھیوں کو نہ صرف تنقید بلکہ دھمکیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ فاطمہ شیخ نے ان تمام مشکلات کے باوجود اپنے مشن کو جاری رکھا۔ ان کی استقامت، حوصلہ اور عزم اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ صرف ایک معلمہ نہیں بلکہ ایک سچی سماجی مصلحہ تھیں۔

فاطمہ شیخ کی کاوشوں کے نتیجے میں بہت سی لڑکیوں اور پسماندہ طبقات کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان کے کام نے نہ صرف تعلیمی میدان میں بلکہ سماجی سطح پر بھی مثبت تبدیلیاں پیدا کیں۔ انھوں نے ثابت کیا کہ تعلیم کسی ایک طبقے یا جنس کا حق نہیں بلکہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ ان کی خدمات نے ہندوستانی سماج میں تعلیمی مساوات کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ فاطمہ شیخ کی زندگی ایک ایسی داستان ہے جو ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ خاموشی سے کی جانے والی خدمت بھی ایک دن تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ اتنی عظیم خدمات کے باوجود، فاطمہ شیخ کا نام طویل عرصے تک تاریخ کے مرکزی دھارے سے غائب رہا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ادب اور سماج میں بھی ان کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی خدمات کو تحقیق کا موضوع بنایا جائے، ان پر مضامین اور کتابیں لکھی جائیں، اور انہیں نصاب کا حصہ بنایا جائے تاکہ نئی نسل ان کے کارناموں سے آگاہ ہو سکے۔ ان کی میراث ایک روشن مینار کے مانند ہے، جو آج بھی ہمیں جہالت کے اندھیروں سے نکال کر علم و آگہی کی روشنی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ بلاشبہ فاطمہ شیخ ایک ایسی خاموش تحریک تھیں جن کی آواز آج ابھر رہی ہے اور آنے والی نسلوں کو مسلسل متاثر کرتی رہے گی۔

ماٰخذ:۔

1 فاطمہ بی شیخ اور سلطانہ چاند بی بی؛ مصنف: نسرین رمضان سید، زید پبلی کیشن ہاؤس، پونے، 2018 صفحہ 21۔23

2 کہانی فاطمہ شیخ کی (ہندی) مصنف: ڈاکٹر انل گجھیے، سمیک پبلی کیشن 3/32 پشچم پوری، نئی دہلی، 2023،

3 فاطمہ شیخ؛ مصنف: سید ناصر احمد، انگریزی ترجمہ Purnanandam BVK

Rashida Khatoon
Research Scholar
Department of Urdu
Khwaja Moinuddin Chishti Language University
Lucknow-226013(U.P)
Mobile:6307850086
rashi786.ze@gmail.com

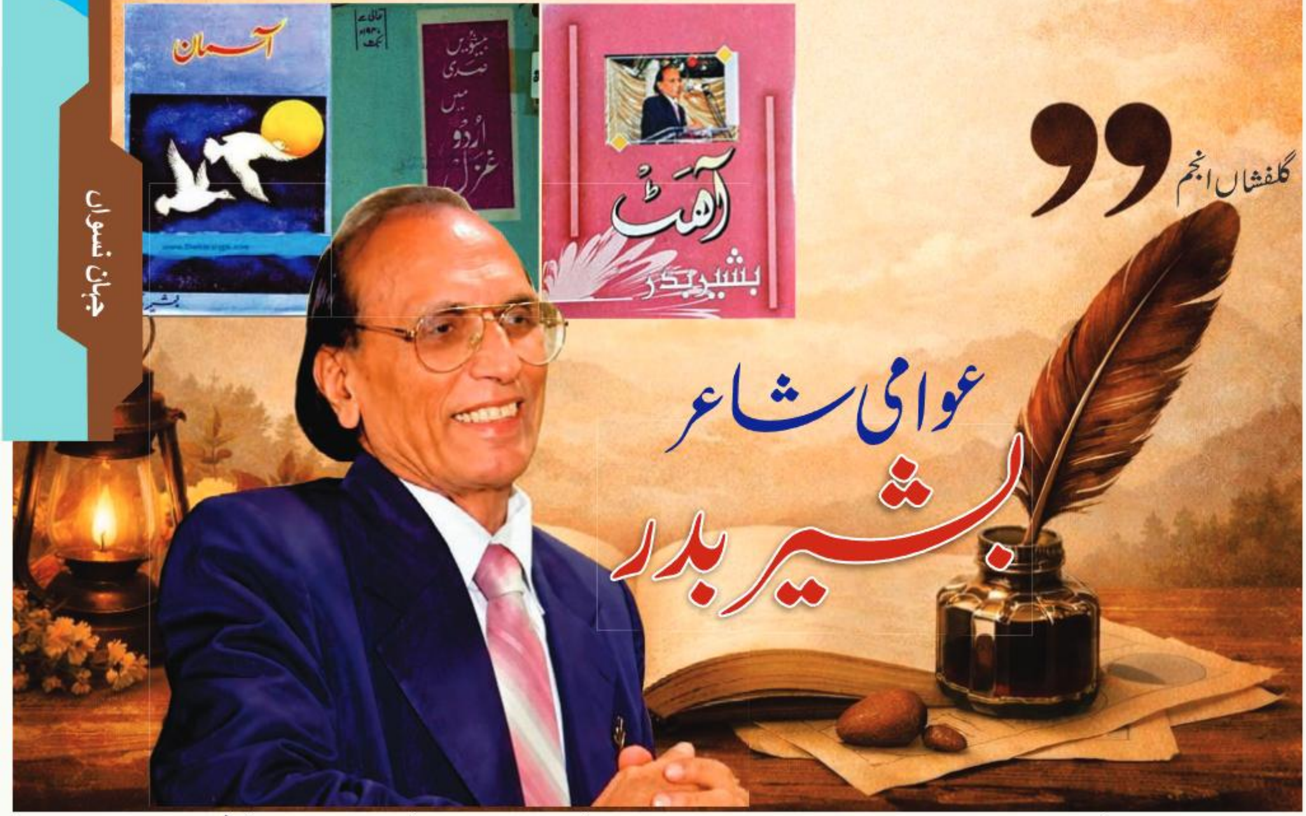

گلفشاں انجم

عوامی شاعر بشیر بدر

معروف شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کا اصل نام سید محمد بشیر تھا۔ وہ 15 فروری 1935 کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد نظیر اور والدہ عالیہ بیگم تھی۔ بشیر بدر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا پھر پروفیسر آل احمد سرور کی زیرنگرانی ''آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ (ہندوستان اور پاکستان میں)'' اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ بشیر بدر کا شمار جدید اردو غزل کے سب سے مقبول اور نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ بشیر بدر بہت سادہ دل اور وسیع النظر انسان تھے انھوں نے ہر مذہب قوم ملت سے عقیدت رکھتے ہوئے شاعری کی ہے یہی ان کی بین الاقوامی شہرت کی دلیل ہے۔ شاعری کوئی فوری عمل نہیں بلکہ ایک تخلیقی عمل ہے ہر تخلیق ایک کرب سے گزرنے کے بعد وجود میں آتی ہے شاعر اس وقت تک کچھ نہیں کہتا جب تک اس کے فکر وخیال حواس خمسہ سے گزر کر اس کے تجربے میں شامل نہ ہوں شاعر کی فکر جس قدر شاعر کے تجربے اور احساس سے قریب ہوگی اس کی شاعری اتنی ہی پرتاثیر ہوگی شاعری ایک صبر آزما عمل ہے اور خاص طور سے صنف غزل جس کے صرف دو مصرعوں میں بڑے سے بڑے موضوع کو بیان کر دیا جاتا ہے ہر بڑا شاعر جہاں اپنی شاعری میں ہر موضوع کو برتتا ہے وہیں اس کی شاعری میں اس کی شخصیت اور کردار کی چھاپ بھی ہوتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ بات کہنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اس اشارے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ موضوع چاہے داخلی ہو یا خارجی اپنے اظہار کا اسلوب خود متعین کرتا ہے اور یہ اسلوب اس شخص کے ذہن میں منتقل ہوتا ہے جو کسی موضوع کا انتخاب کر کے اس سلسلے میں اپنے تاثرات واحساسات کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص کا اسلوب الگ ہوتا ہے اور اسی سے اس کی پہچان ہوتی ہے۔

بشیر بدر عہد شناس شاعر تھے۔ وہ اس حقیقت کو پہچان گئے تھے کہ دور حاضر میں غزل کی زبان ایسی ہو کہ جس میں اس دور کی دیگر زبانوں کے شیریں اور موزوں الفاظ شامل ہوں جس سے غزل کے تغزل میں اضافہ ہو جائے۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے صرف سوچنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے بروئے کار بھی لائے جس سے آج بشیر بدر کا اسلوب غزل کا محبوب اسلوب بن گیا اور نئی غزل کے شعرا بشیر بدر کی تقلید کر کے کامیاب شاعری کر رہے ہیں۔ اس مقام پر پہنچنے کے لیے بشیر بدر کو برسوں تک محنت کرنی پڑی جس کا اظہار انھوں نے اپنے اس شعر میں بھی کیا ہے۔

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

بڑا شاعر وہی مانا جاتا ہے جو انسان کی فطرت کو ذہن میں رکھ کر شاعری کرتا ہو اور اپنے کلام کے ذریعے وہ انسان کو پہلے سے بہتر انسان بننے میں اہم کردار ادا کرتا ہو یہ خصوصیات ہمیں بشیر بدر کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے انھوں نے انسان کی زندگی کے تمام گوشوں پر غور وفکر کر کے اپنی شاعری کو شعور کا نمونہ بنایا ہے۔ بشیر بدر کی شاعری میں دو بنیادی تجربے ملتے ہیں پہلا ایک سادہ اور معصوم انسان جو عشق کی نزاکت اور رنگا رنگی سے لبریز ہے دوسری طرف وہی انسان شہر کی میکانکی اور مروت کش صورت حال سے بیزار۔ بشیر بدر ایک حساس جدید شاعر تھے ان کی شاعری میں زندگی کے مسائل اور اس کے پیچ وخم کی عکاسی بہت نمایاں انداز میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

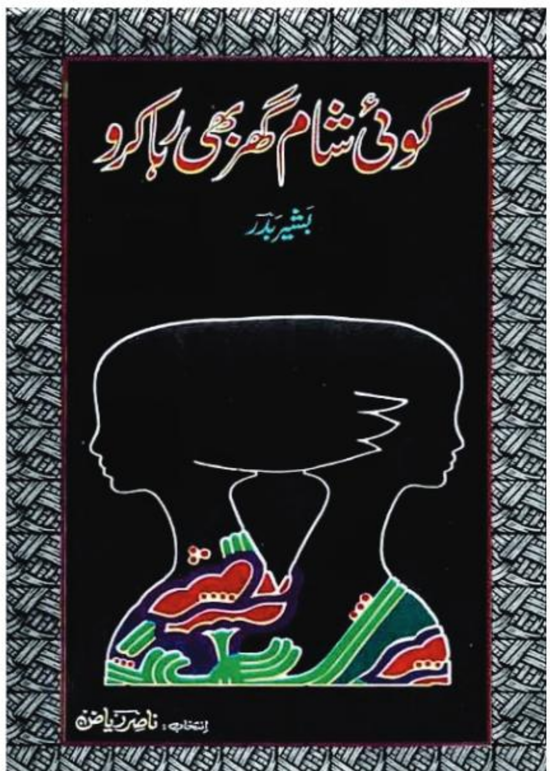

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

بشیر بدر کے چھ شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جو اکائی، امیج، آمد، آسمان، آہٹ، آس، کے نام سے شائع ہوئے ہیں اور ان کی کلیات ہندی زبان میں ’ کلچر یکساں‘ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ بشیر بدر جدید شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید غزل کے نقاد بھی مانے جاتے ہیں بشیر بدر کی کامیابی اور مقبولیت کا راز یہ ہے کہ وہ عام جذبات کو بہت سادگی کے ساتھ عوامی زبان میں پیش کرتے ہیں ان کے کلام میں کسی بھی طرح کی بناوٹ نہیں ملتی بشیر بدر کی شاعرانہ بصیرت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی سادہ دلنشی اور موثر انداز بیان ہے جس کے ذریعے انہوں نے محبت انسانی رشتے اور زندگی کے تمام نشیب وفراز کو عوام کے روبرو لانے کی کوشش کی ہے بشیر بدر کو زندہ رکھنے کے لیے صرف ان کے بیس اشعار کافی ہیں اس بات کا اعتراف خود بشیر بدر نے بھی کیا ہے وہ اشعار آج بھی لوگوں کی زبان پر بے ساختہ آتے ہیں۔

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

بشیر بدر کے یہاں زندگی کے ہر موضوع پر اشعار ملتے ہیں جیسے لفظ فساد ذہن میں آتے ہی بشیر بدر کا یہ شعر ہمارے ذہن میں فوراً آجاتا ہے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

بشیر بدر کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ان کی ندرت خیالی اور نکتہ آفرینی ہے۔ سادگی اور سلاست بھی ان کی غزلوں کا اہم جز رہی ہے ان کے موضوعات چونکا دینے والے ہوتے ہیں انھوں نے چھوٹی بحروں میں بھی لاجواب غزلیں لکھی ہیں بشیر بدر فارسی اور انگریزی میں بھی مہارت رکھتے تھے ان کے شعری مجموعوں کو گجراتی ا سکرپٹ میں بھی شائع کیا گیا ہے اور ساتھ ہی انگریزی اور فارسی زبان میں بھی اس کے ترجمے کیے گئے ہیں بشیر بدر کی شاعرانہ بصیرت کا اندازہ اس شعر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح مادر وطن اور اپنی زمین سے گہری محبت اور لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں:

اس دھرتی کو پیار کیا تھا پیار کیا ہے پیار کروں گا
جب بھی جاؤں میرے سر پر ماٹی کی چادر رکھنا

بشیر بدر بنیادی طور پر محبت کے شاعر ہیں یہ ایک ایسا موضوع ہے جب تک دنیا ہے محبت قائم اور زندہ رہے گی۔ یہ ایسا جذبہ ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ بشیر بدر نے محبت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے غزلوں کا سہارا لیا۔ شعر ملاحظہ کیجیے۔

مجھے خدا نے غزل کا دیار بخشا ہے
یہ سلطنت میں محبت کے نام کرتا ہوں

دوسرا شعر ملاحظہ ہے:

اتنی ملتی ہے میری غزلوں سے تیری صورت
لوگ تجھ کو میرا محبوب سمجھتے ہوں گے

بشیر بدر کے یہاں جدائی بھی محبت کی ایک صورت بن کر سامنے آتی ہے:

مسافر ہیں ہم بھی مسافر ہو تم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

یہ شعر امید، انتظار اور زندگی کے سفر کی خوبصورت علامت بن چکا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک نمایاں وصف انسانی رشتوں کے بدلتے ہوئے رویوں کا گہرا مشاہدہ ہے۔ جدید معاشرے کی مصنوعی قربتوں پر ان کا یہ شعر آج بھی پوری شدت سے صادق آتا ہے:

بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا اور مجھے کبھی نہ ملا

اسی طرح بدلتی ہوئی سماجی قدروں پر ان کی نظر کتنی گہری تھی، اس کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے:

اچھا تمھارے شہر کا دستور ہو گیا
جس کو گلے لگا لیا وہ دور ہو گیا

بشیر بدر محبت کو اخلاص اور سچائی کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ وہ تعلقات میں بناوٹ اور دکھاوے کے سخت مخالف ہیں:

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

یہ شعر آج کے دور میں رشتوں کی صداقت کا معیار بن چکا ہے۔ بشیر بدر کے اشعار میں تنہائی اور اداسی کی کیفیت بھی بار بار سامنے آتی ہے، مگر وہ مایوسی کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی اداسی بھی زندگی کی سچائیوں سے جنم لیتی ہے:

ہم تو کچھ دیر ہنس بھی لیتے ہیں
دل ہمیشہ اداس رہتا ہے

اور پھر زندگی کے کرب کو کتنی شدت سے بیان کرتے ہیں:

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

ان اشعار میں ایک حساس دل کی پوری داستان سمٹ آئی ہے۔ انسان کو عاجزی، محبت اور اخلاق کا سبق دیتے ہیں:

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں میں نے
بس ایک شخص کو مانگا مجھے وہی نہ ملا

یہ شعر محبت کی انفرادیت اور سچے تعلق کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کے کئی اشعار عوامی زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ مثلاً:

سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہو جائے گا
اتنا مت چاہو اسے وہ بے وفا ہو جائے گا

ان کے لفظوں میں ایک ایسی مٹھاس ہے جو دلوں میں اتر جاتی ہے اور ایک ایسی سچائی ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ آج بلاشبہ ڈاکٹر بشیر بدر اردو غزل کی تہذیب، محبت اور انسانیت کے سب سے معتبر نمائندہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر چہ ڈاکٹر بشیر بدر ہمارے درمیان موجود نہیں، لیکن ان کی شاعری زندہ ہے، ان کے اشعار زندہ ہیں اور محبت کا وہ چراغ بھی روشن ہے جو انھوں نے زندگی بھر جلائے رکھا۔ بڑے شاعر کبھی نہیں مرتے، وہ اپنے لفظوں میں زندہ رہتے ہیں اور آنے والی نسلوں کے دلوں میں دھڑکتے رہتے ہیں۔

Gulfeshan Anjum
Research Scholar
RTMNU Nagpur
gulfeshananjum144@gmail.com

عذرا نقوی

مجھے سمجھاؤ مت

(ایک Alzheimer کی مریض ماں کی درخواست)

مجھے اب کچھ نہ سمجھاؤ نہ کچھ بھی یاد دلواؤ
تمھاری کیا سمجھ میں آئے گا میں کون سی دنیا میں رہتی ہوں
میں کتنی مضمحل ہوں کھوئی کھوئی ہوں/ درشتی سے مجھے سمجھاؤ مت!
میں کون ہوں/ تم سے مرا رشتہ ہے کیا؟
یہ کون سا گھر ہے؟ کہاں ہیں سب؟
میں بے بس ہوں، مجھے کچھ یاد ہے اور باقی منظر دھندلے دھندلے ہیں
لڑکپن میں، کبھی ہمجولیوں کے ساتھ باتیں کرتی رہتی ہوں
کبھی بھائی بہن کے ساتھ بچپن کھیلتا ہے گھر کے آنگن میں
کبھی دلہن بنی، میں خوشبوؤں میں ڈوبی ہوتی ہوں

مجھے سمجھاؤ مت! یہ سارا دھوکا ہے/ مجھے ڈانٹو نہیں! میں کیا کروں بولو
مرے بس میں نہیں ہے کچھ/ مجھے سمجھاؤ مت!
بہلاؤ!
میرا ہاتھ تھامو، پیار سے ماتھے پہ بوسہ دو/ یہی کافی ہے میرے
واسطے تم پاس ہو میرے/ مجھے سمجھاؤ مت! آرام کرنے دو
جہاں تک آخری منزل ہے میری، ساتھ دو میرا، سہارا دو
میرے اعصاب کو آرام کرنے دو/ مجھے میری ہی دنیا میں بھٹکنے دو
یہی کافی ہے میرے واسطے تم ساتھ ہو میرے۔

Dr. Azra Naqvi
Rekhta Foundation
B-37,2nd Floor, Sector-1
(U.P)Noida-201301

ذاکرہ شبنم

(نذرِ بشیر بدر)

نہ ملنا تھا مرضی تھی حالات کی
'بڑی آرزو تھی ملاقات کی'

دیے کی طرح جگمگاتے رہے
کرو قدر تم ایسے لمحات کی

نیا موڑ دینا ہے گر زیست کو
تو رو بدلو اپنے خیالات کی

جو کرتے ہیں تقسیم انسان کو
کریں بات انساں کی خدمات کی

نہ دکھ دینا ہرگز کسی کو کبھی
کہ چکی رواں ہے مکافات کی

خدا سے مری بات ہوتی رہی
حقیقت ہے یہ میرے دن رات کی

کروں رشک شبنم میں تقدیر پر
میسر ہو گر توبہ عرفات کی

Zakira Shabnam
C/o Riyaz Ahmad
Shop-No.192
M-G Market.Robertsonpet
K-G-F. Distt. Kolar-563122 Karnataka

یاسمین بانو

سراب

شہر کی اونچی عمارتوں کے ٹھیک پیچھے جہاں گنگا کی سوندھی بو اور شہر کے کوڑے کی سڑاند آپس میں گتھم گتھا رہتی ہیں، ایک ایسی گلی سانس لیتی ہے جسے شہر کا نقشہ نگار بناتے وقت شاید بھول گیا تھا۔ یہاں کی دیواریں پیپ بھرے زخموں کی طرح رستی ہیں اور نالیوں کا کالا پانی گلی کے مکینوں کے مقدر کی طرح ٹھہرا ہوا ہے۔ اس گلی میں وقت سست روی سے چلتا ہے، جیسے کوئی بوڑھا ہانپتا ہوا مزدور بوجھ تلے دبا قدم بڑھا رہا ہو۔ رضیہ بیگم اسی گلی کے ایک کونے میں ایک کچی دیوار کے سائے میں اپنی بوسیدہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ اس کی چارپائی کے پائے ڈھیلے ہو چکے تھے، جو ذرا سی جنبش پر یوں چھکتے جیسے کوئی پرانی قبر کروٹ لے رہی ہو۔ رضیہ نے اپنے میلے دوپٹے کے پلو سے ماتھے پر چمکتے پسینے کو پونچھا، مگر پسینہ تھا کہ اس کی زندگی کی تلخیوں کی طرح تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کا تین سالہ بیٹا منّا اس کی گود میں سر رکھے پڑا تھا، مگر وہ سویا نہیں تھا بلکہ ایک بے ہوشی کی کیفیت تھی جو شدید بخار کی وجہ سے اس پر طاری تھی۔ رضیہ نے منّے کے ماتھے کو چھوا تو اس کی پوریں جلنے لگیں۔ اسے بخار نہیں تھا بلکہ یہ وہ آگ تھی جو خالی پیٹ کی بھٹی سے اٹھ کر رگوں میں دوڑنے لگی تھی۔ رضیہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو کا سوتا کب کا خشک ہو چکا تھا، اب اس کی آنکھیں ایک خشک ریگستان تھیں جہاں برسوں پہلے اس کی خواہشیں دم توڑ چکی تھیں۔ اس نے اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھا۔ وہی ٹوٹے ہوئے برتن، وہی دھواں کھاتی ہوئی کچی جھونپڑی جس کی دیوار پھٹے پرانے کپڑے، پلاسٹک اور چوک چوراہوں سے جمع کیے گئے بینروں سے بنی تھی۔ جو تیز ہوا میں ایسے پھڑ پھڑاتی گویا کسی مرغ بسمل کا پر کسی دیوار سے ٹکرا رہا ہو۔

رضیہ کو یاد آیا کہ ٹھیک بیس سال پہلے اسی محلے میں رونق ہوا کرتی تھی۔ تب وہ اور عائشہ ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھی۔ عائشہ کے بال ریشم کی طرح ملائم تھے اور اس کی بے تکلف ہنسی گلی کی خاموشی کو توڑ دیا کرتی تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں گنگا کے کنارے بیٹھ کر خواب بنتی تھی۔ عائشہ کہتی تھی: رضیہ! میں اس غربت کے کفن کو پھاڑ کر نکل جاؤں گی۔ میں ایک ایسی دنیا میں جاؤں گی جہاں کی ہواؤں میں خوشیوں کی مہک ہوگی، جہاں پیروں تلے مخمل کے ٹاٹ ہوں گے اور جہاں خواہشوں کا جنازہ نکلنا حرام ہوگا۔

رضیہ خاموشی سے اسے سنتی اور سوچتی کہ کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟

عائشہ کی باتیں سنتے سنتے رضیہ بھی خواب کے بیابان وجنگل میں کھو سی جاتی اور حسرتوں کو جیسے پَر لگ جاتے۔ کسی کے آنے کی آواز یا پھر اماں کی بے ہنگم آواز سے دونوں ہوش کی دنیا میں واپس لوٹتے۔

پھر وہ دن آیا جب عائشہ نے اپنے خوابوں کا سودا کیا۔ اس نے ایک ایسے شخص سے شادی کی جو اسے اس سیاہ اور بدبودار گلی سے نکال کر ایک چمکتی ہوئی دنیا میں لے گیا۔ رخصتی کے وقت عائشہ

کی آنکھوں میں آنسو نہیں بلکہ ایک فاتحانہ چمک تھی۔ رضیہ نے اسے اپنا وہ سونے کا کڑا تحفے میں دیا تھا جو اس کی ماں نے اس کے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ رضیہ کی آخری جمع پونجی تھی، مگر سہیلی کی خوشی کے سامنے اس کی کوئی وقعت نہ تھی۔ عائشہ نے وہ کڑا پہنا اور پیچھے مڑے بغیر چلی گئی جیسے اس مٹی سے اس کا کبھی کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ اس نے پھر مڑ کر اس بستی کی طرف نہیں دیکھا جہاں اس کے بچپن کے دن گزرے تھے۔

بیس سال گزر گئے مگر عائشہ کے قدم ان گلیوں میں نہیں پڑے۔ کبھی کبھار اس کے والدین اور چھوٹا بھائی اس کے سسرال جا کر یا پھر شہر کے کسی ہوٹل میں ملاقات کر لیتے۔

"رضیہ کا شوہر پرویز کبھی اسی محلے کے اسکول میں استاد بننے کے خواب دیکھتا تھا مگر قسمت اور گھر کی ذمے داری نے اسے رکشہ چلانے پر مجبور کر دیا۔ شروع شروع میں پرویز کو لگتا تھا کہ رکشہ چلانے سے کچھ آمدنی بھی ہو جائے گی اور میری پڑھائی کا خرچ بھی نکل آئے گا لیکن مقدر نے اسے ہمیشہ کے لیے رکشے کی ہینڈل تھما دی۔"

عائشہ امیر شخص سے شادی کر کے اب ایش بن گئی اور رضیہ بیگم رکشے والے کی بیوی۔

رضیہ گہری سوچ میں گم تھی۔ شوہر پرویز کی آواز پر ایک دم سے چونک پڑی۔ ہڑبڑاہٹ میں اپنی ساڑی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے رضیہ نے پوچھا: آپ کب آئے؟

پرویز کو اس کی یہ حرکت عجیب لگی، وہ اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا: رضیہ آج کل کہاں کھوئی رہتی ہو۔ میں تو تقریباً پانچ منٹ سے تمھارے پاس کھڑا ہوں، مگر نہ جانے تم کس دنیا میں کھوئی ہو۔

'نہیں، کچھ نہیں بس یونہی.... یہ کہہ کر رضیہ پرویز کے لیے پانی لانے کے لیے گھر کے اندر چلی گئی۔

رضیہ کا شوہر پرویز کبھی اسی محلے کے اسکول میں استاد بننے کے خواب دیکھتا تھا مگر قسمت اور گھر کی ذمے داری نے اسے رکشہ چلانے پر مجبور کر دیا۔ شروع شروع میں پرویز کو لگتا تھا کہ رکشہ چلانے سے کچھ آمدنی بھی ہو جائے گی اور میری پڑھائی کا خرچ بھی نکل آئے گا لیکن مقدر نے اسے ہمیشہ کے لیے رکشے کی ہینڈل تھما دی۔ بیمار والدین کے علاج کا بوجھ، دو بہنوں کی شادی اور چھوٹے بھائی کی پرورش کی فکر نے اپنے خواب کچلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ رضیہ بیگم سے شادی کے بعد اس کے دو بچے ہوئے مگر حالات نے کروٹ نہیں بدلی۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے کبھی ستو پی کر تو کبھی رات کا کچھ کھا کر رکشہ کے ساتھ نکل جاتا۔ کچھ لوگ کھانے کے لیے جیتے ہیں مگر وہ جینے کے لیے کھاتا۔ اب رکشہ کھینچتے کھینچتے خود ایک چلتی پھرتی لاش بن چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر جمی دھول اور قمیص پر پسینے کے نشان اس کی روزمرہ کی جنگ کا اشتہار تھے۔

رضیہ... منّا کیسا ہے؟

پرویز نے اپنے چہرے سے پسینہ پوچھتے ہوئے پوچھا۔ رضیہ نے صرف سر ہلا دیا۔ اس کی خاموشی میں ہزاروں شکایتیں تھیں، مگر وہ جانتی تھی کہ پرویز خود بے بس ہے۔

پرویز نے رضیہ کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے اپنی تھیلی سے ایک پرس نکالا۔

یہ دیکھو... آج مور یہ لوک کے باہر ایک بڑی گاڑی سے گرا تھا۔ میں نے اٹھا لیا۔ میم صاحب تو گاڑی میں بیٹھ کر نکل گئیں، مگر یہ پرس وہیں رہ گیا۔

رضیہ نے وہ پرس ہاتھ میں لیا اور جلدی سے کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک امپورٹیڈ پرس تھا مگر بالکل خالی۔ ایک لپ اسٹک اور کچھ میک اپ کے چھوٹے چھوٹے سامان کے علاوہ اس میں ایک ریشمی رومال تھا۔ رضیہ نے جب رومال کو ہاتھ میں لیا تو اس میں بسی پیرس کے کسی قیمتی

عطر کی خوشبو گلی کے تعفن کو چیرتی ہوئی اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ رومال اتنا نرم تھا کہ رضیہ کو لگا جیسے وہ اسے چھو کر میلا کر دے گی۔ اس نے رومال کے کونے کو دیکھا، جہاں باریک ریشمی دھاگے سے 'ایش' لکھا تھا۔ رضیہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے رومال کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ کیا یہ وہی عائشہ تھی جو اب ایش بن چکی ہے؟ کیا مقدر اسے اس رومال کے ذریعے کوئی پیغام دے رہا تھا؟

پرویز نے ایک بار پھر اس کی سوچ و فکر کا سلسلہ توڑتے ہوئے کہا: ارے تم کھڑے کھڑے پھر کھو گئی؟

"عائشہ کے ہونٹوں پر ایک سرد مسکراہٹ ابھری۔ وہی کالی لکیر جو اس کی خوبصورتی کو ایک پراسرار اداسی میں بدل دیتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ پرس کل موریہ لوک کے باہر کہیں گر گیا تھا۔ اسے اس کا افسوس نہیں تھا، بلکہ اسے اس حقیقت سے خوف آرہا تھا کہ اس کی زندگی کی ہر قیمتی چیز دھیرے دھیرے اس سے دور ہو رہی ہے"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے وہ رومال ٹھنڈے پانی میں بھگویا اور منّے کے ماتھے پر رکھ دیا۔ ریشم کی ٹھنڈک نے شاید بچے کے اندر کے الاؤ کو تھوڑا دھیما کیا، اور اس نے پہلی بار سکون سے آنکھیں موند لیں۔ رضیہ سوچنے لگی، کیا عائشہ اب بھی اسے یاد کرتی ہوگی؟ کیا وہ ان اونچی عمارتوں میں بیٹھ کر کبھی اس تنگ گلی کے بارے میں سوچتی ہوگی؟ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسی شہر کے دوسرے کونے پر عائشہ خود ایک ایسے نفسیاتی کرب سے گزر رہی ہے جس کا علاج اس کی دولت کے پاس بھی نہیں تھا۔

شہر کے دوسرے سرے پر جہاں سڑکیں چوڑی اور صاف ستھری تھیں اور جہاں رات کو اسٹریٹ لائٹ کا نور اندھیرے کو قریب بھی نہیں آنے دیتا تھا، عائشہ (ایش) اپنے بنگلے کی بالکنی میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا ایک مہنگا مگ تھا، مگر اس کی کڑواہٹ اس کے وجود کے اندرونی زہر سے کہیں کم تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ آخری بار وہ کھل کر کب ہنسی تھی۔

عائشہ کا شوہر ایک بڑا پراپرٹی ڈیلر تھا، اس کے لیے صرف ایک سماجی سرمایہ (Social Asset) تھا اور عائشہ اس کے لیے ایک ایسی ٹرافی وائف جسے وہ پارٹیوں میں سجا کر لے جاتا۔

ایش! تمھیں کل کے ڈنر کے لیے وہ نیلا گاؤن پہننا چاہیے۔ اس کے شوہر نے کمرے سے آواز دی اور ہاں اپنا وہ امپورٹیڈ پرس بھی ساتھ رکھنا، وہ تمہارے وقار میں اضافہ کرتا ہے۔

عائشہ کے ہونٹوں پر ایک سرد مسکراہٹ ابھری۔ وہی کالی لکیر جو اس کی خوبصورتی کو ایک پراسرار اداسی میں بدل دیتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ پرس کل موریہ لوک کے باہر کہیں گر گیا تھا۔ اسے اس کا افسوس نہیں تھا، بلکہ اسے اس حقیقت سے خوف آ رہا تھا کہ اس کی زندگی کی ہر قیمتی چیز دھیرے دھیرے اس سے دور ہو رہی ہے۔

اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کی کلائی میں وہ ڈائمنڈ بریسلیٹ چمک رہا تھا جس کی قیمت سے رضیہ جیسے دس خاندانوں کی زندگی سنور سکتی تھی، مگر عائشہ کو وہ ایک ہتھکڑی کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنے محلے کی گلی یاد آتی تھی۔ وہ مٹی، وہ بارش کا پانی جس میں وہ اور رضیہ کاغذ کی کشتیاں بہایا کرتی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ کیسے رضیہ نے اسے وہ سونے کا کڑا دیا تھا، جس کے اندرونی حصے پر ان دونوں نے ایک سوئی سے اپنا نام کریدا تھا۔

عائشہ! یہ کڑا تمہیں ہمیشہ یاد دلائے گا کہ تمہاری جڑیں یہاں ہیں رضیہ نے کہا تھا۔

عائشہ نے وہ کڑا پہن تو لیا تھا مگر اس نے اپنے ضمیر پر ایش کا ایسا غلاف چڑھا لیا کہ اسے اپنی جڑیں ہی بوجھ لگنے لگی تھیں۔

اگلے دن شہر کے موسم نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ عائشہ اپنے شوہر کے ساتھ اسی مال میں شاپنگ کے لیے آئی

تھی، جہاں پرویز رکشہ کھڑا کر کے اپنی سواری کا انتظار کرتا تھا۔ مال کے چمکدار شیشوں کے باہر دس سالہ تبریز ننگے پاؤں کھڑا تھا۔ اس کے بال بھیگ چکے تھے اور اس کا بوسیدہ کرتا جسم سے چپک گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کے تھیلوں کا ڈھیر تھا، جو وہ آنے جانے والوں کو پانچ پانچ روپے میں بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگوں کے لیے وہ محض 'ایک لڑکا یا ایک بھکاری' تھا، مگر تبریز کے لیے یہ پانچ روپے اس کی بیمار ماں کی دوا اور رات کے راشن کا ذریعہ تھا۔

عائشہ جب مال سے باہر نکلی تو اس کی نظریں دس سالہ دبلے پتلے تبریز پر جم گئیں۔ بارش کی بوندیں تبریز کے چہرے پر گر رہی تھیں، مگر اس کی آنکھوں میں وہ خودداری تھی جو عائشہ کو برسوں پہلے اپنے بھائی کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔ اس کے بھائی کا نام سمیر تھا مگر عائشہ اسے چنّو کہہ کر بلاتی تھی۔ سخت گرمی کے موسم میں سمیر یرقان اور بخار کی زد میں آ گیا۔ بروقت مناسب علاج نہ ملنے کی وجہ سے اسی کالی گلی کے اندھیرے میں دم توڑ گیا تھا۔

'صاحب! ایک تھیلا لے لیں، میم صاحب کا پرس بھیگ جائے گا،

تبریز نے عائشہ کے شوہر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

'دور رہو! گندے ہاتھ مت لگانا'

اس کے شوہر نے دھکا دیا جس سے تبریز کا پاؤں پھسلا اور وہ کیچڑ میں گر پڑا، اس کے تھیلے بکھر گئے۔ اپنے شوہر کا رویہ دیکھ کر عائشہ کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔ اسے لگا کہ یہ دھکا تبریز کو نہیں، اس کے اپنے ماضی کو لگا ہے۔ وہ دوڑ کر تبریز کے پاس گئی، اپنے شوہر کی حیرت زدہ نظروں کی پروا کیے بغیر اس نے تبریز کا ہاتھ تھاما اور اسے اٹھایا۔ اس نے اپنی کلائی سے وہ بیش قیمت ڈائمنڈ بریسلیٹ اتار کر تبریز کی میلی مٹھی میں دبا دیا۔

'یہ لو... اسے اپنی ماں کو دے دینا۔ کہنا کہ کسی نے قرض ادا کیا ہے۔'

تبریز کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ وہ اس کڑے کو مٹھی میں دبا کر بارش کے تالابوں کو پھلانگتا ہوا اپنی گلی کی طرف بھاگا۔

تبریز دوڑتا ہوا اپنی ماں کے پاس پہنچا۔

امی! دیکھو، ایک پری جیسی میم صاحب نے یہ دیا ہے!

اس نے ہانپتے ہوئے وہ کڑا رضیہ کے ہاتھ میں تھمایا۔ رضیہ ابھی منّے کے ماتھے سے عائشہ کا وہی ریشمی رومال ہٹا کر اسے دوبارہ ٹھنڈے پانی میں بھگونے جا رہی تھی، ساکت رہ گئی۔ اس نے کڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بریسلیٹ کے ہیروں کی چمک میں اسے وہ پرانا سوئی کا نشان نظر آ گیا جو بیس سال کی گرد کے باوجود مٹا نہیں تھا۔ اس پر R اور A صاف نظر آ رہے تھے۔ رضیہ کی چیخ نکل گئی۔

یہ... یہ تو عائشہ کا ہے!

پرویز! دیکھ، یہ وہی کڑا ہے!

پرویز ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھا تھا رضیہ کی بات سن کر چونک پڑا۔

کیا کہہ رہی ہو رضیہ؟ وہ میم صاحب یہاں کہاں؟

رضیہ نے وہ ریشمی رومال اٹھایا جس پر عائشہ کا نام کڑھا ہوا تھا۔

پرویز وہ مال کے باہر جو امیر خاتون تھی جس کا یہ پرس ہے وہی عائشہ ہے۔ اس نے ہمیں دیکھا نہیں مگر اس کے مقدر نے ہمیں ڈھونڈ لیا ہے۔

اسی وقت گلی کے دہانے سے ایک سیاہ مرسڈیز گزری۔ عائشہ نے گاڑی کے شیشے سے اس اندھیری گلی کو دیکھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا دیا ہوا کڑا اس وقت اس کی سب سے عزیز سہیلی کے ہاتھ میں ہے، اور اس کا کھویا ہوا رومال اسی بچے کی تپش کم کر رہا ہے جس کا باپ اس کے شوہر کا رکشہ کھینچتا ہے۔

رات گہری ہو گئی تھی اور شہر کی روشنی بجھنے لگی تھی، مگر رضیہ کی جھونپڑی میں ایک چراغ جل رہا تھا۔ منّے کا بخار اتر چکا تھا، شاید اس ریشمی رومال کی تاثیر تھی یا اس کڑے سے جڑی دعاؤں کا اثر۔ رضیہ نے وہ کڑا سینے سے لگا رکھا تھا، جیسے وہ اپنی سہیلی کا ہاتھ تھامے ہوئے ہو۔ عائشہ اپنے عالیشان بیڈروم میں خاموش لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی وہ سیاہ لکیر اب تھوڑی ہلکی پڑ گئی

تھی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی کی پہیلی کا حل دولت میں نہیں، بلکہ اس ربط میں ہے جو ہم انسانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ مونالیزا کی وہ مسکراہٹ اب بھی ایک راز تھی مگر رضیہ، عائشہ اور تبریز کے لیے وہ راز کھل چکا تھا۔ زندگی تضادات کا نام ہے جہاں ایک کا فیشن دوسرے کا کفن ہوتا ہے اور ایک کا تحفہ دوسرے کی زندگی۔ وہ سیاہ لکیر اب ان کے درمیان فاصلہ نہیں، بلکہ ایک ایسا رشتہ بن چکی تھی جو طبقات کی ہر دیوار کو گرا چکا تھا۔ شہر سو رہا تھا، مگر اس رات پٹنہ کی اس کالی گلی میں انسانیت جاگ رہی تھی۔

رضیہ بیگم نے منّے کے ماتھے سے وہ ریشمی رومال ہٹایا تو اسے محسوس ہوا کہ بچے کا جسم اب آگ کی طرح نہیں تپ رہا تھا، بلکہ اس میں زندگی کی وہ لہر واپس آ گئی تھی جو شاید صرف دوا سے ممکن نہیں تھی۔ اس نے رومال کو اپنے ماتھے سے لگایا۔ عطر کی خوشبو اب ماند پڑ چکی تھی، مگر اس میں اب بھی ایک ایسی مانوس مہک باقی تھی جو رضیہ کو بیس سال پیچھے ان دنوں میں لے گئی جب عائشہ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر اپنے خواب سنایا کرتی تھی۔

پرویز... یہ کڑا... یہ صرف سونا نہیں ہے، یہ عائشہ کا پچھتاوا ہے۔ اس نے شاید ہمیں پہچانا نہیں، مگر اس کے اندر کی اسی عائشہ نے ہمیں ڈھونڈ لیا جسے وہ برسوں سے مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

رضیہ سرگوشی کے انداز میں پرویز سے بات کر رہی تھی ۔ چارپائی کے ایک کونے پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے پرویز بڑی دلچسپی سے رضیہ کی باتیں سن رہا تھا۔

پرویز نے سر اٹھا کر اپنی بیوی کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے پاس الفاظ نہیں تھے، بس اس نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے رضیہ کے ہاتھ میں تھمے اس بریسلیٹ کو چھوا۔ اسے یاد آیا کہ کیسے وہ پورا دن مال کے باہر رکشہ کھڑا کر کے ان بڑی گاڑیوں کو حسرت سے دیکھتا تھا، یہ جانے بغیر کہ ان میں سے ایک گاڑی میں اس کے گھر کی خوشیاں اور اس کے بچپن کی یادیں سفر کر رہی تھیں۔ دوسری طرف شہر کے سب سے پرسکون گوشے میں واقع اس عالیشان بیڈروم میں عائشہ (ایش) اب بھی جاگ رہی تھی۔ اس نے اپنے ریشمی لباس کی پرواہ کیے بغیر بالکنی کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کی کلائی اب خالی تھی، مگر اسے وہ بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا جو پچھلے پندرہ سالوں سے اسے تھکائے ہوئے تھا۔ اسے یاد آیا کہ کیسے وہ بریسلیٹ دیتے وقت تبریز کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے وہی چمک لہرائی تھی جو کبھی رضیہ کی آنکھوں میں ہوا کرتی تھی۔ عائشہ کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ آئی جو شاید مونالیزا کے راز سے بھی گہری تھی۔ یہ وہ مسکراہٹ تھی جو تب آتی ہے جب انسان اپنی جڑوں سے دوبارہ جڑ جاتا ہے۔ تبریز اب اپنی ماں کے پاس فرش پر سو رہا تھا، خواب میں اب بھی بارش کے پانی میں کاغذ کی کشتیاں بہا رہا تھا۔ اس کے خواب میں وہ کشتیاں ڈوب نہیں رہی تھیں، بلکہ تیرتی ہوئی ایک ایسے مقام کی طرف جا رہی تھیں جہاں نہ کوئی مال تھا، نہ کوئی بدبودار گلی بلکہ صرف ایک لامتناہی انسانیت کا سمندر تھا۔ صبح کی پہلی کرن جب قریب کی اونچی عمارتوں سے ٹکرا کر اس تنگ گلی میں پہنچی، تو رضیہ نے وہ قیمتی پرس اور بریسلیٹ ایک پرانے صندوق میں چھپا کر رکھ دیا۔ وہ اسے بیچنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ چیزیں اب اس کی بقا کا نہیں، بلکہ اس کے وقار کا حصہ ہیں۔ مونالیزا کی وہ کالی لکیر اب کسی کے چہرے پر نہیں تھی، بلکہ وہ فضا میں ایک دھندلی لکیر بن کر اڑ چکی تھی۔ زندگی نے اپنے تمام تضادات کے ساتھ ایک دائرہ مکمل کر لیا تھا۔ عائشہ کی دولت، رضیہ کی ممتا، پرویز کی جدوجہد اور تبریز کی محنت نے مل کر ایک ایسی تحریر لکھی تھی جسے شہر کا کوئی ادیب نہیں لکھ سکتا تھا۔ یہ افسانہ اب کاغذ پر ختم ہو گیا تھا مگر شہر کی ان تنگ و تاریک گلیوں میں یہ ایک ایسی حقیقت بن کر زندہ رہے گا۔

❒❖❒

Dr. Yasmin bano
Assistant Professor
S N Sinha College
Jehanabad-804417(Bihar)
Mob: 8541884224
yasminisbano@gmail.com

مات

صاحبہ فردوس

''حسن آپ کب تک آئیں گے واپس؟'' وہ کچھ ملول سی ہوکر بولی تھی۔ ٹائی باندھتے ہوئے حسن کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے تھے، گویا اسے یہ سوال بالکل بھی پسند نہیں آیا ہو۔

''ابھی میں گھر سے نکلا بھی نہیں ہوا اور تم ہو کہ سوال پوچھنے بیٹھ گئی۔'' اپنے لہجے کی بیزاریت پر قابو پاتے حسن نے کہا تو وہ خفگی سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''مجھے آپ کی اس جاب سے سخت چڑ ہے جس میں مہینے کے پندرہ دن مجھے آپ سے دور رہنا پڑتا ہے۔ میں تنگ آگئی ہوں آپ کی ایسی جاب سے۔'' اس کی بات سن کر حسن کے سرخ مائل لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی جیسے اپنی برتری کا احساس ہوا ہو۔

''اچھا جی آپ کہتی ہیں تو میں یہ جاب چھوڑ دیتا ہوں۔'' حسن نے محبت سے اس کا نرم گرم سا ہاتھ تھام کر اسے اپنے سامنے کھڑا کیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک الگ ہی نشہ اتر آیا تھا جیسے کوئی گستاخی کرنے کا جی چاہ رہا ہو۔ وہ مہر کی طرف جھکا ہی تھا کہ ماہم نے اس کی شرارت جان کر اسے دھکا دے دیا اور بولی۔

''اچھا اب جائیں آپ کا ٹائم نہیں ہو رہا ہے کیا؟'' اس کی اس حرکت پر وہ بدمست سا ہو کر دور ہٹ گیا اور بولا۔

''ٹھیک ہے جا رہا ہوں بھئی یہاں تو شوہر کی قدر ہی نہیں ہے۔'' اس کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ حسن اور ماہم کی شادی کو تین سال گزر چکے تھے۔ ان تین سالوں میں وہ حسن کی ذات کے الگ الگ پہلو سے آشنا ہوئی تھی۔ عجیب طبیعت پائی تھی حسن نے کبھی محبت نچھاور کرنے پر آتا تو سرتا پا اپنی محبت میں ڈبو دیتا اور جب بے رخی برتتا تو کئی دن تک بات بھی نہیں کرتا۔

ماہم حتی المقدور کوشش کرتی کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو اور حسن روٹھ نہ جائے۔

تین سال شادی کے گزرنے کے باوجود دونوں کی کوئی اولاد نہیں تھی جب وہ حسن سے اپنی اولاد نہ ہونے کی شکایت کرتی تو وہ خاموشی کی چادر اوڑھ لیتا اور سفاکی سے کہتا۔

''اتنی بھی کیا جلدی ہے ہو ہی جائے گی ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے ہماری شادی کو۔'' اس کی بات پر وہ بھی لاپرواہ ہو جاتی جب اسے جلدی نہیں تھی تو اسے کیا پڑی تھی۔ وہ بھی مست مگن ہو کر زندگی کی حسن میں کھو جایا کرتی تھی۔ حسن کی جاب ایسی نوعیت کی تھی کہ وہ پندرہ دن اس کے پاس رہتا اور پندرہ دن دور، اور یہ دوری اسے شدت سے اپنی تنہائی کا احساس دلایا کرتی تھی۔

تنہائی میں وہ نیم پاگل ہو جایا کرتی تھی۔ اسی دوران اس کی دوستی مون سے ہوئی تھی۔ مون سے اس کی ملاقات آرٹ گیلری میں ہوئی تھی۔ جس کے بعد سے دونوں میں ایسی دوستی ہوئی کہ وہ دونوں اپنا غم غلط کرنے کی خاطر ایک دوسرے کے پاس دوڑی دوڑی چلی آیا کرتی تھیں۔ حسن کے جانے کے بعد اس نے اچانک ہی مون سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جھلسا دینے والی دھوپ اور حبس کی قید سے نکل کر موسم نے اچانک سے کروٹ لی تھی۔ سیاہ گھنگھور بادل سفید اور آسمانی رنگ کا امتزاج لیے آسمان پر قابض ہو کر قہقہہ لگا رہے تھے۔ ہوائیں بھی مدہوش سی ہو کر ان کے قہقہوں میں ساتھ دے رہی تھیں۔ زمین پیاسی ندی بنی آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی کہ کب وہ انھیں سیراب کرتے ہیں۔

موسم کی اس آنکھ مچولی اس میں بھی پرلطف جذبات پیدا کر رہے تھے۔ وہ جو مون سے پورے چار مہینوں کے بعد ملنے جا رہی تھی۔ موسم کی بدلتی رت نے اس کے انگ انگ میں سرشاری دوڑا دی تھی۔ حسن کے بعد اس نے زندگی میں جسے اپنے ساتھ سب سے مخلص پایا تھا وہ مون ہی تھی۔ مون حالات کی ستائی ہوئی لڑکی تھی جو

بے پناہ حسن کی دولت سے مالا مال تھی مگر سوتیلے رشتوں کی اجنبیت جھیلنے کے بعد وہ پتھر ہوچکی تھی اس پتھر میں شگاف دونوں کی دوستی نے ڈالا تھا۔مون نے اپنا ہر درد اس پر عیاں کردیا تو مہر نے بھی اسے اپنی زندگی کے ہر پہلو سے آگاہ کردیا تھا۔

دوسال پہلے مون کی زندگی میں ایک ایسا شخص آیا تھا جسے وہ بے پناہ محبت کرنے لگی تھی پھر فوراً ہی مون نے اس سے شادی کرلی تھی۔وہ کتنا تڑپی تھی مون کی شادی اٹینڈ کرنے کے لیے مگر حسن کی غیر موجودگی کے سبب وہ شادی میں شریک نہ ہوسکی تھی۔پھر اس نے کتنی بار مون سے معافی مانگی تھی اور مون نے کافی دنوں کی ناراضگی کے بعد اسے معاف کیا تھا۔

ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد وہ مون کے گھر پہنچی۔مون نے حسب عادت اس کا پرجوش استقبال کیا۔ڈھیر ساری لوازمات وہ اس کے سامنے سجائے بیٹھی تھی۔دونوں ایک دوسرے سے اپنی اپنی باتیں شیئر کررہی تھیں تبھی مون نے کہا۔

”جانتی ہو تم خالہ بننے والی ہو۔“بڑے ہی ڈرامائی انداز میں مون نے اس پر یہ انکشاف کیا تھا جس پر وہ مارے خوشی کے جھوم اٹھی تھی۔

”کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”ہاں بھئی۔“مون کے شرمانے کی ادا اسے بہت پسند آئی تھی۔وہ مون کے لیے جتنی خوش تھی اپنے لیے اتنی ہی افسردہ تھی۔باتوں باتوں میں کب رات کے سائے پر پھیلا گئے دونوں کو پتا ہی نہیں چلا وہ گھر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی تبھی مون نے کہا۔

”اتنی رات کو تنہا جاؤ گی حسیب کو آنے دو ان کے ساتھ چلی جانا۔“اسے انکار کرکے وہ داخلی دروازے تک پہنچی۔مون بھی اسے الوداع کہنے کے لیے گیٹ تک آئی تھی تبھی اطلاعی گھنٹی بجی تھی۔

”میں نے کہا بھی تھا رک جاؤ حسیب آتے ہوں گے اور دیکھو آگئے۔“مون نے اتنا کہہ کر جیسے ہی دروازہ کھولا تو مسکراتے ہوئے حسیب کے چہرے کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر شاکڈ ہوچکے تھے۔

”حسیب آج کافی دیر لگادی آپ نے؟“حسیب نے خاموش نظروں سے روتی ہوئی ماہم کو دیکھا تھا جو اپنے آنسوؤں پر ضبط کرتی ہوئی بولی تھی۔

”اچھا مون میں چلتی ہوں۔“اتنا کہہ کر وہ وہاں سے نکل گئی حسیب نے بھی مون کا سوال نظر انداز کرکے اس کی طرف دوڑ لگائی تھی۔وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی تب وہ ماہم سے بولا۔

”ماہم پلیز میری بات تو سنو۔“

”مجھے کوئی بات نہیں سننا حسن اوہ سوری مون کے حسیب۔“ اتنا کہہ کر اس نے ڈرائیور سے گاڑی آگے بڑھانے کے لیے کہا۔اس کے جانے پر حسن کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور گاڑی میں سوار ماہم اپنے آنسوؤں کو پیتی رہی۔

اور یہ بھی شاید اتفاق ہی تھا کہ اس کی مون کے شوہر حسیب سے ابھی تک کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی وہ جتنی بار بھی مون کے گھر جاتی اس کا شوہر گھر پر ملتا ہی نہیں تھا۔اس نے مون کی شادی کی تصویریں بھی مانگی تھیں مگر مون نے بڑی خوبصورتی سے کہا تھا۔

”حسیب کو تصویریں لینا بالکل پسند نہیں ہے اس لیے میرے پاس ان کی تصویر نہیں ہے۔“جس پر وہ کتنا حیران ہوتی تھی حسن کو بھی تو تصویریں لینا پسند نہیں تھا۔

پھر دوسرے ہی دن حسن گھر پہنچا تو خالی گھر اس کو منہ چڑھا رہا تھا۔اس نے ہر جگہ ماہم کو تلاش کیا مگر وہ نہیں ملی ہاں میز پر سفید پھڑ پھڑاتا ہوا کاغذ ملا جس پر لکھا تھا۔

”محبت کسی کو اپنی قید میں رکھنے کا نام تو نہیں ہے نا۔محبت تو میرے خیال سے آزاد جذبہ ہے جو کسی کو بھی کہیں بھی کبھی بھی ہوسکتی ہے پھر میں نے بھی محبت کو پنجرے میں قید کرنے کی بجائے آزادی دے دی کم از کم میں نہیں تو تم تو خوش رہ سکتے ہوسیب۔“ ماہم کا خط پڑھ کر وہ کتنا پچھتا رہا تھا، کتنی بڑی مات ملی تھی اسے۔

Saheba Firdous
Shaniwara Peth Alam Chwok
Anjangaon Surji
Distt. Amravati-444705 (M.S)
sahebafirdous22@gmail.com

صاعقہ غیاث

نیا بزنس

وینٹی لیٹر کے گردو پیش مختلف سمتوں میں کھڑی مشینیں کسی خاموش پہرے دار کی طرح اپنی ذمے داری نبھا رہی ہیں۔ امید کی ایک لرزتی کرن ہر لمحہ بجھ جانے کے خوف کے ساتھ آلات کی سرخ و سبز بتیوں میں ٹمٹما رہی ہے۔ ڈائلاسس کا پائپ بے رحمی سے گلے میں پیوست ہے جہاں سے رگوں میں بہتا خون مشین کے وجود میں داخل ہو کر صفائی کے بعد دوبارہ جسم میں منتقل ہو رہا ہے۔ آکسیجن ماسک سانسوں کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دینے میں مصروف ہے۔ جسم کے کئی اعضا بیک وقت ناکارہ ہو چکے ہیں، اب ان کی کارکردگی کا بوجھ مشینیں اٹھا رہی ہیں۔ مریضہ کا جسم انجکشنوں، نالیوں اور تاروں کے حصار میں کچھ اس طرح مقید ہے گویا زندگی کو زنجیروں سے باندھ کر روکے رکھنے کی ایک بے بس کوشش جاری ہے۔

”نانی۔۔۔۔۔مما گھر کب جائیں گی۔“ ایک بچی کی آواز آئی سی یو میں ابھری۔

” جلد ہی بیٹا۔۔۔“ عورت نے آہستہ سے کہتے ہوئے اپنے رخسار پر ڈھلکتے آنسو بچی سے چھپا کر پونچھ لیے۔

عورت بچی کو گود میں لے کر باہر نکل آئی۔ وہ اپنی بیٹی عمارہ کو اس حالت میں دیکھ کر ذہنی و دلی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔

”سب کچھ ٹھیک تھا، نارمل تھا۔۔۔۔۔ پھر کنڈیشن اتنی خراب کیسے ہو گئی۔۔۔

” آپ لوگوں سے ہی کوئی غلطی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ اور اب اسے چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔۔۔۔ میری بہن کو کچھ ہوا تو ہاسپٹل کا نقشہ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔“ ایک کڑیل جوان سینئر ڈاکٹر سے مخاطب ہے جس کے پیچھے سات سے آٹھ لوگ کھڑے ہیں۔

”دیکھیے مسٹر۔۔۔۔۔ حد میں رہ کر بات کیجیے۔۔۔۔ ہمیں پولیس بلانے میں دیر نہیں لگے گی۔۔۔ ہم علاج کر رہے ہیں۔۔۔ ہماری ٹیم پوری کوشش کر رہی ہے۔“ سینئر ڈاکٹر نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

” کوشش مطلب کیا؟۔۔۔۔ آپ بچے کو ڈسچارج کر چکے ہیں۔۔۔۔ ماں کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔۔۔۔ اس کا بدن پھول کر کالا پڑتا جا رہا ہے۔۔۔ آپ نہ تو ٹھیک سے جانکاری دے رہے ہیں اور نہ ہی کسی کو ملنے کی اجازت دے رہے ہیں!۔۔۔۔“ اس جوان کے پیچھے سے نکل کر دوسرا آدمی ڈاکٹر کے قریب آ گیا۔

ڈاکٹر کے ساتھ باتیں جھڑپ میں بدل گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس لڑکی کے خاندان اور جان پہچان کے سیاسی رسوخ والے لوگوں کی بڑی تعداد ہسپتال میں جمع ہو گئی۔ کہا سنی یہاں تک بڑھی کہ ڈاکٹر کا گریبان پکڑ لیا گیا۔ ویڈیوز بنائے جانے لگے۔ ہسپتال کی سچائی سوشل میڈیا پر دکھائی جانے لگی۔ پولیس کے آنے کے بعد ہسپتال کی ہنگامہ خیز فضا میں کچھ ٹھہراؤ آیا اور معاملہ وقتی طور پر تھم گیا۔

عمارہ، محمود صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی جس کی شادی چند برس

پہلے انھوں نے بڑے ہی اہتمام اور دھوم دھام سے کی تھی۔ عمارہ ماں بننے کی سعادت پہلے ہی پا چکی تھی اور جب اللہ کے فضل وکرم سے دوبارہ خوشی نے دستک دی تو آٹھ مہینے مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ مائیکے آ گئی۔ خوش اخلاقی، سادگی اور محبت بانٹنے والی یہ پیاری بچی سب کی دعاؤں کا مرکز بن گئی۔ رحمت سے نوازے جانے کے بعد عمارہ ہی نہیں بلکہ پورا خاندان نعمت کی آمد کا منتظر تھا۔ شوہر نے بھی کام کاج سے بڑھ کر اپنی زوجہ کو اہمیت دی اور اس نازک وقت میں ساتھ رہنا ضروری سمجھا۔ ننھی کلکاریوں کے دن جیسے جیسے قریب آ رہے تھے، عمارہ کا حسن اور وقار دوبالا ہوتا جا رہا تھا۔

اتوار کی صبح عمارہ کے شوہر ناشتے کے بعد ہسپتال پہنچے تو منظر بدلا ہوا پایا۔ رات کے وقت اچانک عمارہ کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے خون کی کئی بوتلیں چڑھائیں، دوائیں دیں، مہنگے انجکشن لگائے لیکن کوئی مثبت اثر ظاہر نہ ہوا۔ بالآخر عمارہ کو آئی سی یو میں داخل کرنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے گھر والوں کو تسلی دی کہ کبھی کبھی کمزوری کے باعث ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں، عمارہ کی حالت جلد ہی سنبھل جائے گی۔ بچے کو ڈسچارج کر دیا گیا

والد، شوہر اور تین بھائیوں کے باہمی مشورے سے یہ طے پایا کہ عمارہ کی ڈلیوری شہر کے مشہور 'سینٹرل ہسپتال' میں کروائی جائے۔ 'سینٹرل ہسپتال' شہر کا جانا مانا ہسپتال تھا۔ سب کی محبت اور دعاؤں کے حصار میں جمعہ کے روز عمارہ کو ہسپتال لے جایا گیا۔ سنیچر کو وہ خوش خبری مل ہی گئی جس کا سبھوں کو انتظار تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں والا معصوم بچہ جھولے میں ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا جیسے اپنی آمد کا جشن آپ ہی منا رہا ہو۔

اتوار کی صبح عمارہ کے شوہر ناشتے کے بعد ہسپتال پہنچے تو منظر بدلا ہوا پایا۔ رات کے وقت اچانک عمارہ کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے خون کی کئی بوتلیں چڑھائیں، دوائیں دیں، مہنگے انجکشن لگائے لیکن کوئی مثبت اثر ظاہر نہ ہوا۔ بالآخر عمارہ کو آئی سی یو میں داخل کرنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے گھر والوں کو تسلی دی کہ کبھی کبھی کمزوری کے باعث ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں، عمارہ کی حالت جلد ہی سنبھل جائے گی۔ بچے کو ڈسچارج کر دیا گیا۔

عمارہ کی خبر ملتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔ آس پاس کے لوگ آنے جانے لگے، خیریت دریافت کی جانے لگی۔ اگلے دن ڈاکٹر نے ڈھکے چھپے انداز میں عمارہ کی مجموعی حالت سے اہلِ خانہ کو آگاہ کیا۔ کڈنی اور لیور فیل ہو چکے ہیں، بلڈ پریشر کنٹرول میں نہیں آ رہا ہے۔ سانس لینے میں شدید دشواری کے ساتھ پھیپھڑوں کا حال بھی تشویشناک ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق عمارہ کو یہ سب انفیکشن کے باعث ہوا ہے۔

بات کھلتے ہی شوہر، والدین اور بھائیوں کے دلوں پر بجلی گر گئی۔ عمارہ کی جدائی کا خوف ستانے لگا۔ ڈاکٹروں کے لہجے سے گھر والوں کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ یہ سب ان ہی کی لاپرواہی کا نتیجہ ہے اور اب ہر ممکن کوشش پردہ پوشی کے لیے کی جا رہی ہے۔ عام لوگوں کے لیے یوں بھی ڈاکٹروں کے پیچیدہ ہتھکنڈے سمجھنا مشکل ہوتا ہے تو پھر عمارہ کے گھر والے کیسے سمجھ پاتے؟ اس گھر میں تقریباً سبھوں کی تعلیم اوسط درجے کی ہی تھی۔ محمود صاحب کے منجھلے بیٹے توصیف نے ڈاکٹروں کی چالاکی بھانپ کر ہوشیاری دکھائی۔ وہ اپنے ساتھ پہچان کے ڈاکٹر ابھے اور سینئر نرس کو ہسپتال لے گیا۔ پہلے تو ہسپتال کے عملے نے عمارہ سے ملاقات کی اجازت دینے میں ہچکچاہٹ دکھائی لیکن بعد میں اجازت دے دی گئی۔ توصیف کی ذہانت کے سبب صورت حال ذرا واضح ہوئی تو شک یقین میں بدل گیا۔ غم و غصے میں ڈوبے اہلِ خانہ نے ذمے دار ڈاکٹروں کا گھیراؤ کیا اور جواب طلب کیا، جس کے نتیجے میں پولیس پہنچ گئی۔

ڈاکٹروں اور ہسپتال کے عملے کو آج کی گہما گہمی سے اندازہ

ہوگیا کہ یہ معاملہ آسانی سے دبنے والا نہیں۔ وینٹی لیٹر پر مریض کا دماغ کوما میں چلا جاتا ہے البتہ دل کام کرتا رہتا ہے۔ ایسے میں دور سے کسی کے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ مریض زندہ ہے یا نہیں۔ اسی بات کا پورا فائدہ اٹھایا جا رہا تھا لیکن رات کے گیارہ بجے عمارہ کے دل نے بھی دھڑکنا بند کردیا۔

''سر۔۔۔ پیشنٹ عمارہ کی ڈیتھ ہوگئی۔'' ہسپتال کے ڈائرکٹر کو کال کی گئی۔

'' وہاٹ۔۔۔چیک ہر اگین۔۔۔۔از! سی؟۔۔۔'' ڈائرکٹر بھی اس خبر پر سکتے میں آگیا۔

''سر۔۔۔'' سینئر ڈاکٹر نے ڈائرکٹر کی خاموشی توڑی۔

''لیسن۔۔۔۔ وری کیرفل۔۔۔۔۔کسی بھی طرح یہ بات باہر نہیں جانی چاہیے کہ ہم ٹرینی ڈاکٹر سے لاکھوں روپے لے کر انھیں سرجری کرنے دے رہے ہیں۔۔۔۔ مانا سینئر ڈاکٹر کی عدم موجودگی کے سبب یہ غلطی ہوئی ہے۔۔۔۔ اورلڑکی کے آرگنز فیل ہوگئے۔۔۔۔لیکن ہمارے نئے بزنس کا راز، راز ہی رہے تو ہم اس موقعے سے بھی منافع کما سکتے ہیں۔۔۔۔ سرجری کرنے والے ٹرینی ڈاکٹر کی تفصیل مجھے میل کرو۔۔۔۔ میں کمشنر سے بات کرتا ہوں۔۔۔سوچا تھا پیسے دے کر معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔۔۔ مگر یہ جاہل آسانی سے ماننے والے نہیں۔۔۔۔ اب ہماری مدد پولیس کرے گی۔۔۔۔۔تم وہاں سب نارمل رکھو۔۔۔۔ جب تک میں نہ کہوں ڈیتھ کی خبر باہر نہیں جانی چاہیے۔۔۔۔بل جتنا ہوسکے، انکریز کرو۔۔۔۔ پندرہ لاکھ سے اوپر کردو۔۔۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟۔۔۔۔ اسپتال کی ریپوٹیشن پر ذرا بھی داغ آیا تو اس کی قیمت تم اپنے لائسنس سے ادا کرو گے۔۔۔۔ مجھے اپنے نئے بزنس میں گھاٹا نہیں چاہیے۔۔۔۔ انڈرسٹینڈ؟'' ڈائرکٹر کا دماغ برق رفتاری سے منصوبے بنانے لگا۔

'' یس سر۔۔۔۔ ڈونٹ وری۔۔۔۔۔'' سینئر ڈاکٹر کانپتی آواز میں بولا۔

اگلی صبح پولیس کی دو وین توصیف اور اس دوست کے گھر پہنچ گئیں جس نے ہسپتال میں ڈاکٹر کا گریبان پکڑا تھا۔ پولیس نے وارننگ دی اور گرفتاری کی دھمکی بھی۔ دوسری طرف توصیف کے قریبی ڈاکٹر کو بھی پولیس کمشنر کا فون آیا۔ انھوں نے ڈاکٹر کو سمجھاتے ہوئے توڑ پھوڑ اور ہنگامے کے نقصانات گنوائے اور پیسے لے کر خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔

عمارہ کی موت کی خبر سن کر گھر والے ہسپتال پہنچے لیکن وہاں یہ بتایا گیا کہ عمارہ کی حالت اب پہلے سے بہتر ہے۔ اگر آپ ڈسچارج کروانا چاہتے ہیں تو یہ آپ کی اپنی ذمے داری ہوگی۔ عمارہ کے شوہر اور والد نے اللہ عزوجل کا شکریہ ادا کیا۔ گھر پر اطلاع دی گئی۔ دعاؤں کا سلسلہ اور تیز ہوگیا۔ دو دن امید کے سہارے کٹے، تیسرے دن توصیف ہسپتال پہنچا تو منظر بدل چکا تھا۔ ہسپتال کی عمارت کے باہر بڑی تعداد میں فورس تعینات تھی اور بڑی گاڑیوں کے ساتھ بسیں کھڑی تھیں۔ وہ ان سب کو دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوا تو اپنے بہنوئی کو فرش پر بیٹھے سر پکڑ کر روتا پایا۔

''کک۔کیا ہوا؟'' توصیف کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔

'' ختم ہوگیا۔۔۔۔ سب کچھ ختم ہوگیا۔۔۔۔ عمارہ نہیں رہی۔۔۔۔ یہ سب ان لوگوں کی سازش تھی۔۔۔۔۔۔'' عمارہ کا شوہر زار و قطار رونے لگا۔ توصیف کو محسوس ہوا جیسے دنیا چند لمحوں کے لیے ساکت ہوگئی اور ہر شئے اپنی جگہ تھم گئی ہے۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے والد کو اطلاع دی۔ دوپہر تک خاندان کے تمام افراد بچے بوڑھے اور عورتیں ہسپتال پہنچ گئے۔ جان پہچان والے لوگوں کے ساتھ کچھ مقامی لیڈر بھی آگئے اور محکمہ ہسپتال کے رویے کی وجہ سے انھوں نے عمارہ کی لاش لینے سے انکار کردیا۔

'' آپ لوگوں نے جب ماں کو مار ہی دیا ہے۔۔۔۔۔تو بچوں کو بھی مار ڈالیں۔۔۔۔۔انھیں کیوں زندہ چھوڑ رہے ہیں؟'' عمارہ کے چچا اور بھائی نے دونوں بچوں کو ڈاکٹر کی ڈیسک پر بیٹھا دیا۔ انھوں نے احتجاج کرتے ہوئے ماں کی موت اور بچوں کی پرورش کے معاوضے کا مطالبہ کیا۔

بچے شور سے ڈر کر رونے لگے۔ بحث بڑھنے لگی تو پولیس نے

سب کو باہر نکال دیا۔ سبھی لوگ ہسپتال کی بلڈنگ کے سامنے بیٹھ گئے۔ بھیڑ بڑھتی گئی، لوگ رات بھر دھرنے پر بیٹھے رہے۔ میڈیا نے پورے واقعے کو کور کیا۔ نیوز چینلوں پر خبریں دکھائی جانے لگیں لیکن ہسپتال کی انتظامیہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اتنا سب کچھ دیکھ کر بھی علاج کروانے والے نئے پیشنٹس آتے رہے اور چیزیں حسب معمول چلتی رہیں۔ پُر زور احتجاج کے باوجود کوئی ان سے بات تک کرنے نہیں آیا۔ آخر لوگ ناچار ہوکر خود ہی اٹھے اور اپنی لڑائی عدالت میں جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ عمارہ کی لاش ہسپتال سے ڈسچارج کرالی گئی۔ ہسپتال نے معاوضے کے طور پر جھوٹا بل معاف کر دیا۔

"عمارہ کا ننھا فرشتہ کمرے میں بھوک سے تڑپ رہا تھا۔ اس کی ماں کے ماتم میں ننھی کلکاریاں کسی نے نہیں سنیں۔ عمارہ کی والدہ غش کھا کھا کر گر رہی تھیں۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ رو رہی تھیں اور اسی حالت میں عمارہ کے جسم کے نزدیک رینگتے کیڑوں کو ہٹا رہی تھیں جو عمارہ کے جسم سے ہی باہر آرہے تھے۔ اس دل لرزاں جنازے میں پورا شہر اکٹھا تھا۔ تمام فرائض کی ادائیگی کے ساتھ عمارہ کی تدفین عصر کے بعد کی گئی۔ عمارہ کے گھر اور اطراف میں چند دنوں تک سوگوار خاموشی چھائی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ بھولنے لگے۔ ہفتے بھر بعد ہی کسی کو یاد نہ رہا کہ عمارہ کو یا اس کے مظلوم بچوں کو انصاف ملا یا نہیں"

عمارہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے دوسرے شہر بھیجی گئی۔ آس پاس پوسٹ مارٹم کروانے سے مختلف خدشات تھے۔ رپورٹ میں غیر معمولی چھیڑ چھاڑ کر کے سچائی چھپانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اس کام کو مکمل ہونے میں دو دن کا وقفہ لگ گیا۔

عمارہ کی لاش تدفین کے لیے گھر لائی گئی۔ کافی تعداد میں لوگ اس کے آخری دیدار کو پہنچے۔ غسل دینے کے لیے جیسے ہی پلاسٹک بیگ کھولا گیا لاش کی بدبو دور تک پھیل گئی۔ چند عورتوں کو ابکائی آنے لگی۔ سڑاند سے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ اسی پھولوں سی لاڈلی بچی کی لاش ہے؟ اس کے بدن پر بے شمار زخموں کے نشانات تھے۔ پوسٹ مارٹم کا زخم اور بھی بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ سے خون بہہ کر جم گیا تھا۔۔ چہرہ اور جسم حد سے زیادہ پھول جانے کے سبب اب کسی کے لیے بھی عمارہ کو پہچاننا ایک دشوار امر تھا۔

عمارہ کا ننھا فرشتہ کمرے میں بھوک سے تڑپ رہا تھا۔ اس کی ماں کے ماتم میں ننھی کلکاریاں کسی نے نہیں سنیں۔ عمارہ کی والدہ غش کھا کھا کر گر رہی تھیں۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ رو رہی تھیں اور اسی حالت میں عمارہ کے جسم کے نزدیک رینگتے کیڑوں کو ہٹا رہی تھیں جو عمارہ کے جسم سے ہی باہر آرہے تھے۔ اس دل لرزاں جنازے میں پورا شہر اکٹھا تھا۔ تمام فرائض کی ادائیگی کے ساتھ عمارہ کی تدفین عصر کے بعد کی گئی۔ عمارہ کے گھر اور اطراف میں چند دنوں تک سوگوار خاموشی چھائی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ بھولنے لگے۔ ہفتے بھر بعد ہی کسی کو یاد نہ رہا کہ عمارہ کو یا اس کے مظلوم بچوں کو انصاف ملا یا نہیں۔

شہر کی فضا آج بڑی دلفریب ہے۔ موسم سہانا ہے اور ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ لوگ شام کے ناشتے کے ساتھ تازہ خبریں نوش فرما رہے ہیں۔ اور بریکنگ نیوز چل رہی ہے۔ "شہر کے سینٹرل ہسپتال میں ایک اور موت۔۔۔۔ مرتک کے گھر والے بارش میں ہی بیٹھے دھرنے پر۔۔۔۔ انصاف کی اپیل۔۔۔۔۔"

❖□❖

Saiqa Gayas
MR / 49 Masjid Mohallah Benachity
Durgapur -13, Post : Benachity
Dist : Paschim Burdwan -713213 (W.B)
E- mail : saiqagayas308@gmail.com

ارتباط

جولائی 2026 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سب سے پہلے میری نظر سرورق پر گئی، سرورق پر قلم، نوٹ بک اور کمپیوٹر کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی اس بات کی علامت ہے کہ عورت اپنی منزل کی طرف زور وشور سے گامزن ہے۔ اس کے ہاتھ میں قلم اور کمپیوٹر ہے اب وہ اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے لکھنے کی اہل ہو چکی ہے۔ ابھی میں سرورق کی معنوی جہتیں ہی سمجھ رہی تھی کہ میری نظر پھر سے اداریے پر ٹک گئی۔ اداریے میں بھی سرورق کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی بات کی گئی ہے۔ ایک جملے نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا'' اگر مرد اساس معاشرہ اس پہلو کے تئیں بیدار نہ ہوا تو خواتین خود بہ خود اپنا حق اور اپنی جگہ لے لیں گی'' اداریے میں خواتین کی کمزوری نہیں بلکہ قوت ارادی کو موضوع بنایا گیا۔ واقعی اداریہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔

اس کے علاوہ اس شمارے کے تمام مضامین عمدہ ہیں۔ نئی نئی شاعرات پر مضامین ہیں، جو اب تک پردۂ خفا میں تھیں یا میری رسائی نہیں ہوئی تھی۔ 'جہان نسواں' کے تحت نجمہ بیگم کا مضمون ' آل احمد سرور کی نثر نگاری' بہت دیدہ ریزی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ایک کہانی جو گرمکھی سے اردو میں ترجمہ ہے وہ بھی عمدہ کہانی ہے۔ جس کی مترجم رینو بہل صاحبہ ہیں۔ فکشن پر بھی کئی مضامین موجود ہیں۔ جن میں نگار عظیم، ذکیہ مشہدی قابل ذکر ہیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ قابل توجہ ہے اور اس کا وہ مضمون جو دیا نارائن نگم کے انڈین نالج سسٹم کے تناظر میں لکھا گیا ہے علم میں اضافہ کا باعث ہے۔

خوشندا جمیل، محلّہ آزاد نگر، قصبہ تمبور، سیتا پور (یو پی)

جولائی 2026 کا شمارہ موصول ہوا۔ ہر ماہ کی طرح اس ماہ کا شمارہ بھی رعنائیاں لیے ہوئے ہے۔ ہر ماہ شمارے میں نئی معلومات سے آگاہ کرایا جاتا ہے۔ ماہنا خواتین دنیا اپنی اشاعت کے دس سال مکمل کر چکا ہے۔ ان دس سالوں میں رسالے میں وقت وقت پر بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ رسالے کے مزاج اور اس کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے نئے کالم بھی شروع کیے گئے ہیں۔ مشعل، شخصیت، روبرو، جہان نسواں، حسن سخن، افسانے اور قارئین کے خطوط اس میگزین کے اہم کالمز ہیں وقتاً فوقتاً اس میں نئے کالمز کا بھی اضافہ کیا جاتا ہے تاکہ میگزین کے معیار میں اور اضافہ ہو سکے۔

جولائی کا یہ شمارہ بھی اپنے تمام تبدیلی کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ اس ماہ کا رسالہ بھی نیا پن لیے ہے۔۔ انٹرویو بھی اعلیٰ معیار کا ہے۔ جہان نسواں کے تحت تمام مضامین معیاری ہیں۔ غزلیں بھی عمدہ معیار کی ہیں۔ رینو بہل کے ذریعے ترجمہ شدہ کہانی ایک اور فالتو عورت پڑھ کر اچھی لگی۔ دوسری کہانی جسے ام سلمہ نے لکھا ہے وہ بھی دل موہ لینے والی ہے۔ ' نگار عظیم کی افسانوی جہتیں' اور ' آل احمد سرور کی نثر نگاری' معنی خیز مضامین ہیں۔

رخسانہ پروین، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अगस्त-२०२६ वर्ष: १०, अंक: ८

Mahnama Khawateen Duniya Monthly August 2026, Vol.10 Issue: 8

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-08-2026
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

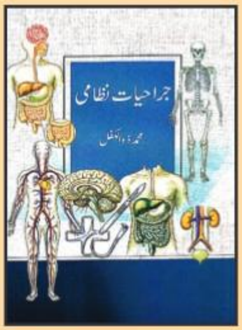

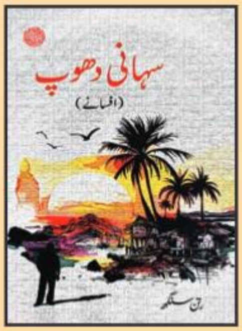

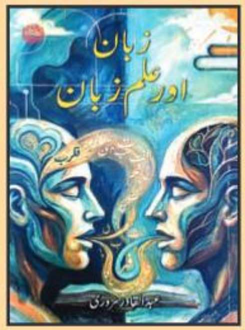

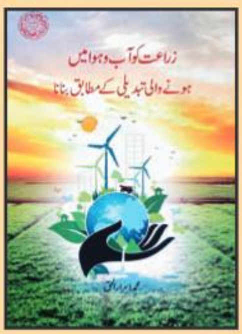

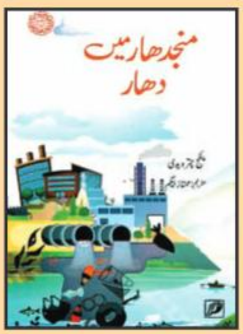

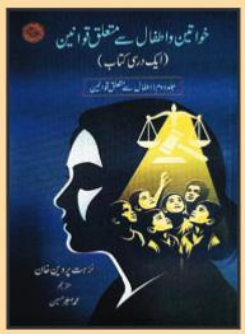

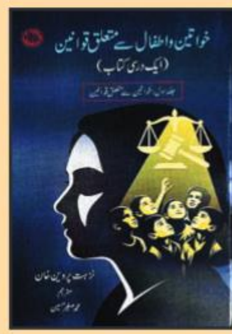

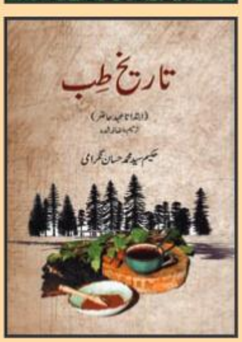

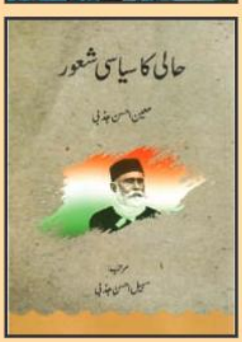

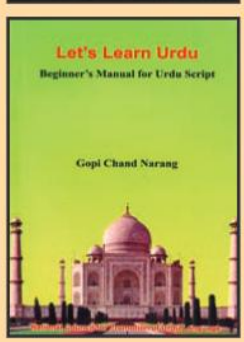

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P) And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ مطبوعات

سکینۃ الاولیا

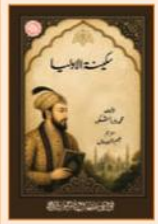

تالیف: محمد داراشکوہ

مترجم: علیم اشرف خاں

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 255، قیمت: 185 روپے

بحریات

مصنّفین: میری طاہر، طاہر حسین

مترجم: سید ظفر الاسلام

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 486 قیمت: 315 روپے

امیر خسرو: ایک ہمہ جہت شخصیت

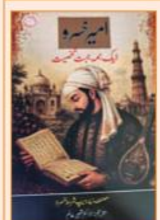

مصنف: پردیپ شرما خسرو

مترجم: ڈاکٹر شبیر عالم

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 344، قیمت: 235 روپے

عملی روحانیت

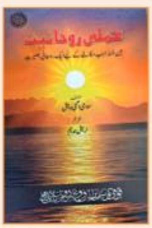

مصنف: سوامی اگنی ویش

مترجم: نریش ندیم

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 88، قیمت: 100 روپے

آؤ جانوروں سے ملیں

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 131

قیمت: 190 روپے

عصری لغت

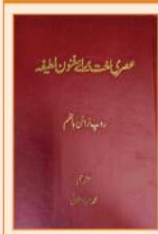

روپ نرائن باتھم

مترجم: محمد سجاد عثمانی

صفحات: 606، قیمت: 685 روپے

پہلی اشاعت: 2026

کلیاتِ سودا (جلد اوّل)

مصنف: محمد حسن

تیسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 564

قیمت: 360 روپے

اردو تدریسی قواعد

مصنف: علی رفاد فتیحی

دوسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 484

قیمت: 305 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in